تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس اُردو

سہ ماہی ادبیات اطفال میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار: تطہیر زہرا

291-FLL/MSURDU/S22

نگران: ڈاکٹر بی بی امینہ

لیکچرار، شعبۂ اُردو

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ تطہیر زہرا رجسٹریشن نمبر 291.FLL/MSURDU/S22 نے ایم۔ایس اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"سہ ماہی** ادبیات اطفال **میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر بی بی امینہ

لیکچرار، شعبۂ اردو

فہرست

پیش لفظ	VI
باب اوّل	1
ماحولیاتی تنقید اور ادبِ اطفال: بنیادی مباحث	1
فطرت:	1
فطرت پسندی:	1
فطرت کے متعلق شعور و آگاہی کے حوالے سے حضرت علی کرم اللہ وجھہ کے مشاہدات	8
فطرت کا جمالیاتی نظم:	10
ماحول:	10
ماحول کی اقسام	14
ماحولیات:	15
نو آبادیات اور فطرت کا استحصال:	21
ادب اطفال: بنیادی مباحث	34
طریقہ تحقیق (فریم ورک):	45
حوالہ جات:	47
باب دوم	52
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال (۲۰۲۲ء۔۲۰۱۸ء) میں فطرت سے متعلق شعور کا مطالعہ بحوالہ نظم	52
تعارف:	52
فطرت سے متعلق شعور کا مطالعہ:	53
حوالہ جات:	85
باب سوم	89
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال (۲۰۲۲ء۔۲۰۱۸ء) میں فطرت سے متعلق شعور کا مطالعہ بحوالہ نثر	89
فطرت کے متعلق شعور و آگاہی اور ادبیاتِ اطفال کی نثر:	90

حوالہ جات: 126

باب چہارم 129

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال کی نظموں اور کہانیوں میں فطرت کو لاحق خطرات، ان کا تحفظ اور ہماری ذمے داریاں 129

فطرت کو لاحق خطرات اور ہماری ذمہ داریاں: 129

حوالہ جات: 157

ماحصل 160

سفارشات 165

فہرستِ مآخذ 166

رسائل و جرائد 168

انٹرنیٹ 169

پیش لفظ

بچوں کی تعلیم و تربیت ،زبان دانی، ذہنی نشوونما، تعمیرِ اخلاق، ادبی ذوق اور تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور اُن کی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے جہاں دیگر عوامل کار فرما ہوتے ہیں وہاں ادبِ اطفال بھی کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا ادب ہے جو بچوں کی ذہنی عمر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عام فہم زبان میں نظم اور نثر کی صورت میں تحریر کیا جاتا ہے۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نظم اور نثر کے موضوعات میں بھی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں یورپ کے ادبِ اطفال میں بڑوں کا ادب، وقت کی پابندی، صفائی کا خیال رکھنا، عاجزی و انکساری، نیکی اور شر کی تمیز ، سچائی اور دیانتداری جیسی عادات سکھائی جاتی تھیں ۔لڑکوں کو خود مختار ،فیصلہ باز، باہمت، بہادر اور معاشرے کے کفیل کے طور پر پیش کیا جاتا جب کہ لڑکیوں کے لیے نرم لہجہ ،وفاداری، سلائی کڑھائی اور چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا جیسی خوبیوں اور اقدار کو اپنانے کی ترغیب دی جاتی۔ یہ صنفی کردار اس دور کے معاشرے کے عکاس تھے جب کہ آج کے دور میں لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر اہمیت دی جاتی ہے۔ اُردو ادب میں انیسویں اور بیسویں صدی میں بچوں کی تربیت کے لیے اخلاقی اور مذہبی کہانیاں لکھنے کا آغاز ہوا۔ قیامِ پاکستان سے ۱۹۷۵ء تک تحریکِ پاکستان، جدوجہدِ آزادی ،وطن کی محبت، مناظرِ پاکستان، سیرتِ انبیا، سیرتِ بزرگانِ دین، تحریکِ آزادی کے رہنما جیسے موضوعات کا انتخاب کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء سے ۲۰۰۱ء تک حُب الوطنی ،بچوں کے کھیل، فطرت، جنگلی حیات، کشمیر، ہمارے ہیروز، جنات، پریوں، جادوگروں جاسوسی، سائنسی کہانیاں اور نظمیں لکھی گئیں۔ حمد و نعت کی صنف ہر دور میں ادبِ اطفال کا لازمی حصہ رہی ہے۔ اس طرح صحت ، کھیل اور فطرت پر بھی توجہ مرکوز رہی۔ ۲۰۰۱ ء کے بعد دنیا تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے آج کل بچے وسیع النظر ہیں۔ ۔ ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی کے اس دور میں روبورٹ، کمپوٹر ، انٹرنیٹ کا درست استعمال ، خلا ستارے ، موبائل گیمز کے مضر اثرات ، مصنوعی ذہانت اہم عنوانات ہیں۔ اقوامِ عالم میں اتفاق اور امن ، بچوں کا تحفظ ، خواتین ، خواجہ سراؤں کے حقوق، لڑکے اور لڑکی کی برابری اور بھائی چارہ جیسے اہم امور پر شعرا اور نثر نگاروں کے پیشِ نظر ہیں۔ لیکن ماحولیاتی تبدیلی اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھا جا رہا ہے۔ کرہ ارض کی تپش نے آئندہ فطرت اور انسانی بقا کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ گلیشیرز پگھل رہے ہیں، قدرتی آفات معمول بن چکی ہیں، پرندے اور دیگر جنگلی حیات کی اقسام

معدومیت کا شکار ہیں۔ ماہرِ لسانیات نوم چومسکی موسمیاتی تبدیلیوں کے خطرات سے اقوامِ متحدہ کو آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "دو نسلوں کے بعد ایک منظم انسانی معاشرے کا وجود ناپید ہو سکتا ہے، عالمی موسمیاتی حدت جس نے انسانی بقا کو خطرے میں ڈال دیا ہے جس کے سبب انسانی زندگی کو خطرہ ہے جو کہ ایٹمی جنگ کے خطرے سے کم نہیں ہے۔"

ماحولیاتی بحران صرف چند ممالک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اقوامِ عالم کا مسئلہ ہے کیوں کہ اس کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی ایک ملک تنہا اس پر قابو پا سکتا ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق اگر اس پیچیدہ مسئلے پر قابو نہ پائے گا تو آئندہ آنے والی نسلوں کا مستقبل تاریک ہوتا چلا جائے گا۔ موسمیاتی تبدیلی اور عالمی حدت زمین کے لیے عظیم ترین خطرے کی علامت بن چکے ہیں۔ ماہرینِ موسمیات خبر دار کر رہے ہیں کہ موسمیاتی تبدیلی کی وجہ سے آئندہ آنے والی نسلیں یا تو اُس ماحول میں ڈھل جائیں گئی یا معدوم ہو کر رہ جائیں گی اگر شروع سے ہی بچوں میں فطرت سے محبت اور فطرت کے تحفظ کا جذبہ پیدا کیا جائے تو بچے آنے والے دور میں موسمیاتی تبدیلیوں پر قابو پانے کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے۔

۱۲ جون ۲۰۲۳ء میں کولمبیا ایمزون کے جنگل میں ایک طیارہ گر گیا۔ ایک سال سے تیرہ سال کی عمر کے قریب ایک درجن بچے تیرہ سالہ بنزلی کی نگرانی میں چھے ہفتوں تک زندہ رہے جو کہ تاریخ میں انسانی بقا کی ایک مثال ہے۔ یہ بچے ماحولیاتی تعلیم و تربیت سے آراستہ تھے بنزلی کو معلوم تھا کہ کون سے پتوں سے آلودہ پانی صاف ہو جاتا ہے جنگل میں کون سے پھل اور بیج انسان کا کھا سکتا ہے، خیمہ کیسے بنایا جاتا ہے، مچھروں، سانپوں دیگر جنگلی جانوروں اور بارش سے بچوں کا تحفظ کیسے کیا جا سکتا ہے یہ واقعہ بچوں کی تعلم و تربیت کی افادیت کے حوالے سے قابلِ توجہ ہے۔

لہذا آئندہ ایسا ادبِ اطفال تخلیق کرنے کی ضرورت ہے جو بچوں کی تخلیقی و فکری تعلیم و تربیت کو فطرت اور ماحول سے جوڑنے میں معاون ہو۔ نیز تمدن، آب و ہوا اور بچوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ انسانی افعال سے ماحول وجود میں آتا ہے انسانی رویوں کے سبب ارد گرد مثبت اور منفی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ہمارے سیارے زمین کا درجہ حرارت تسلسل کے ساتھ بڑھتے جانا انسان کے منفی رویے کا نتیجہ ہے۔ بچوں اور فطرت کا باہمی تعلق اس سلسلے میں ادبِ اطفال کا کردار، ماہرینِ موسمیات کے فطرت، انسانی بقا، خاص طور پر بچوں کے مستقبل کے متعلق خدشات جیسے موضوعات میرے تحقیقی مقالے سہ ماہی ادبیاتِ اطفال میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کا محرک بنے۔ اسی

تناظر میں ادب اطفال سے وابستہ دورِ حاضر کے شعرا اور کہانی نویس بچوں میں فطرت، فطرت کو لاحق خطرات اور اس سلسلے میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں اس حوالے سے اُن میں شعور بیدار کرنے میں کس حد تک کوشاں ہیں یہ ہی تحقیقی مقالے کا مقصد ہے۔ سہ ماہی ادبیات اطفال بچوں کے لیے لکھا جانے والا سہ ماہی رسالہ ہے جو اکادمی ادبیات اسلام آباد سے سن ۲۰۱۷ء میں جاری کیا گیا۔ فطرت یا ماحول کے متعلق شعور اور آگاہی کے حوالے سے اس رسالے کا حصہ نظم اہم حیثیت رکھتا ہے۔ زیر نظر تحقیق میں جولائی ۲۰۱۷ء سے جون ۲۰۲۳ء تک شائع ہونے والے ۲۴ جریدوں کا مطالعہ کیا گیا ہے جن میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۲۲ء تک بچوں کے حوالے سے لکھی گئی مختلف نظمیں اور کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے ۷۵ سال پورے ہونے پر شمارہ جات اٹھارہ، انیس، بیس اور اکیس ڈائمنڈ جوبلی کے عنوان سے شائع کیے گئے جو کہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ حصہ نظم کی بات کی جائے تو متذکرہ بالا ۲۴ رسالوں میں کل ۱۹۶ نظمیں شامل کی گئی ہیں جن میں قریب ۸۵ نظمیں فطرت اور ماحول کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ ادبیاتِ اطفال کے رسالوں میں شعرا نے سب سے زیادہ توجہ موسموں اور مختلف اوقات (صبح ،دوپہر، شام) پر دی۔ ان نظموں میں زمینی اور آبی جانوروں اور چڑیا گھر جیسے موضوعات پر ۲۴ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ تتلیوں، جگنوؤں اور شہد کی مکھی پر دس نظمیں، خوب صورت پرندوں پر گیارہ جب کہ سمندر، دریا اور ندیوں وغیرہ پر پانچ نظمیں ان رسالہ جات میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف نظاروں پر آٹھ ،، پھولوں پر تین اور دنیا کے متعلق ایک نظم لکھی گئی۔ اس طرح خلا کے حوالے سے سورج کے متعلق ایک نظم جب کہ چاند سے دو نظموں کا رشتہ جوڑا گیا ۔ادبیاتِ اطفال کے رسالہ جات میں چھے سو کہانیوں میں قریب ایک سو سے زیادہ کہانیاں فطرت کے مختلف مظاہر سے متعلق موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں خوب صورت پرندوں، پھولوں، تتلیوں، پاکستان کے دلکش مقامات، جنگلات، گلیشیرز، ندیوں، دریاؤں، بارش، چاند ستاروں اور دیگر مظاہر قدرت سے بچوں کو روشناس کروایا گیا ہے۔

ماحول کے حوالے سے عصر حاضر کا سب اہم مسئلہ ماحولیاتی آلودگی اور موسمیاتی تبدیلی ہے۔ اس مسئلے کو ادبی حلقوں نے سنجیدگی سے لیا اور کہانیوں اور نظموں کے ذریعے بچوں میں اس متعلق شعور و آگاہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سہ ماہی ادبیات اطفال میں ماحولیاتی موضوعات پر کہانیاں لکھنے کا باقاعدہ آغاز ۲۰۱۷ء میں ہوا۔ ماحولیاتی موضوعات پر مشتمل کہانیاں ان شماروں میں شامل کی گئیں جن کا تجزیہ اس باب میں کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کہانیوں میں مصنفین نے کوشش کی ہے کہ بچے فطرت سے محبت کریں ،فطرت سے سیکھیں اور فطرت کے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ تتلیوں، پرندوں اور جانوروں کو قیدی بنانا، پھول توڑنا، درختوں کو کاٹنا، آبی اور فضائی آلودگی پھیلانا وغیرہ جیسے افعال سے سخت نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

الحمَدللہ میرا مقالہ مکمل ہوا۔ یہ مقالہ تحریر کر کے میں نے ادبِ اطفال میں ماحولیاتی عناصر کے حوالے سے اپنے حصے کا ایک مدھم سا چراغ روشن کر دیا ہے۔ میں نے اپنے والد مبشر عباس کے ادبی ذوق اور مقالہ کے موضوع کے متعلق معلومات سے خوب استفادہ حاصل کیا۔ میرے اساتذہ کرام نے میری راہنمائی کی خاص طور پر میم سائرہ بتول زیدی کی ممنون ہوں ۔ میرے والدین اور نانی اماں کی دعائیں میرے ساتھ رہیں۔ میرے ہم سفر عباس شیرازی نے بے حد حوصلہ افزائی اور تعاون کیا۔ طالب علم ساتھیوں، عباس علی بھائی، بہنوں خاص طور پر فاطمہ رباب نے کسی نہ کسی حوالے سے اس کاوش میں میری معاونت کی میں سب کے لیے شکر گزار ہوں۔

میں ہمیشہ ممنون رہوں گی اپنے فرائض کا مکمل فہم و ادراک رکھنے والی شفیق نگران بی بی امینہ لیکچرر شعبہ اُردو جھنوں نے میری راہنمائی کی۔ میں نے غیر موزوں اوقات میں نہ جانے کتنی بار اُن کو تنگ کیا جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ محترمہ بی بی امینہ آپ کا بہت شکریہ۔

تطہیر زہرا

بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد

۵، ستمبر ۲۰۲۵ء

باب اوّل

ماحولیاتی تنقید اور ادبِ اطفال: بنیادی مباحث

فطرت:

فطرت کے معنی قدرت، کائنات اور مایہ کے ہیں۔ فطرت کے متعلق قدیم ترین نظریات تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ارسطو(Aristotle)، روسو(Rousseau)، فریڈرک نطشے(Friedrich Nietzsche)اور کارل مارکس (karl Marx) کے ہاں مل جاتے ہیں۔ ادب میں فطرت(Nature) سے مراد وہ سب کچھ ہے جسے انسان نے نہیں بنایا۔ دھرتی، امبر، آفتاب و ماہتاب، ستارے، کہکشاں ، چشمے، آبشاریں، دریا، سمندر، پہاڑ، نباتات، حشرات، حیوانات، طیور، ہوائیں، سحاب، موسم، خاموشی، سکون اور انسانی جبلتیں وغیرہ یہ سب فطرت ہے۔ ادب میں فطرت انسانی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور روحانیت کے حوالے سے یہ خدا کے قرب کا ذریعہ ہے۔

روایتی ادب میں فطرت کو خوب صورتی، سکون اور روحانیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر برکھا اداسی یا پاکیزگی کی علامت جب کہ بہار کو محبت اور امید کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ پت جھڑ نے پریشانی، جدائی، زوال اور موت کی علامت کے طور پر ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ غرض یہ کہ فطرت انسانی جذبات اور خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

جدید ادب اور ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں اب فطرت کو صرف مظاہرِ قدرت یا صرف دل کشی اور خوب صورتی کے طور پر نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کا سیاسی اور اخلاقی پہلو بھی زیر نظر رکھا جاتا ہے۔ نیز انسانی غفلت اور عدم توجہی کو ماحولیاتی بربادی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ ادب میں فطرت کا موضوع قدیم ہے لیکن حالات اور زمانے کے ساتھ ساتھ فطرت کا مفہوم اور تعریف بھی تبدیل ہوتی رہی ہے۔

فطرت پسندی:

فطرت پسندی کی اصطلاح کا آغاز فرانسیسی ادب سے ہوا۔ فرانسیسی ادب کے جن عظیم شعرا نے اسے جلا بخشی ان میں کومٹے (Comte)، ہیپولیٹ طین(Hippolyte Taine)، ایملی زولا(Emile Zola) اور ڈارون (Darwin) شامل ہیں۔ انھوں نے فطرت کو نظریاتی بنیادوں پر استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ فطرت پسندی

کو کائنات کی حیاتیاتی وسعتوں سے ہم کنار کرتے ہوئے ان فطرت پسندوں کے یہاں انسان کی زندگی اور اس کا کردار سماجی حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ فطرت کے مختلف مظاہر انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو متاثر کرتے ہیں جو فطرت کا دلدادہ ہو اسے فطرت پسند کہتے ہیں۔ یورپ اور برصغیر میں بھی بہت سے شعرا نے فطرت کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔[1]

برطانوی شاعر ولیم ورڈزورتھ (۱۸۵۰ء۔ ۱۷۷۰) نے محبت اور فطرت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور انھوں نے فطرت کا ظاہری اور باطنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ ان کی شاعری سے علامہ اقبال جیسے شاعر اور مفکر بھی متاثر تھے۔ ورڈزورتھ فطرت کو اخلاقی اور روحانی تربیت کے سلسلے میں ایک استاد کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ فطرت ہمیں محبت، سادگی اور ہمدردی کا درس دیتی ہے۔ فطرت انسان کی روحانی تجدید اور ذہنی اطمینان اور سکون کا ذریعہ ہے۔ فطرت کا یہ شاعر انسانی جذبات اور خیالات کی عکاسی فطرت کے مختلف رنگوں کے ذریعے کرتا ہے۔

"A healing balm to weary minds."[۲]

(وہ فطرت کو تھکے ذہنوں کو شفا اور سکون دینے والی قوت اور مرہم کہتا ہے)

فطرت ایک دلکش منظر اور تفریح کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک روحانی تجربہ بھی ہے۔ فطرت روح کو چھوتی ہے۔ ورڈزورتھ سادگی، عام سی زندگی اور دیہی مناظر کو اہمیت دیتا ہے کیوں کہ اس میں خلوص اور سچائی ہے۔ وہ فطرت کو تنہائی کا بہترین ساتھی سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ برطانیہ کے ایک قصبہ لیک ڈسٹرکٹ کی طرف ہجرت کر گیا تھا جو جھیلوں کے حوالے سے جانا جاتا ہے، اور آخری وقت تک وہیں قیام پذیر رہا۔ اس کے مطابق فطرت وفادار دوست کی مانند ہے۔ فطرت اس دل سے کبھی بے وفائی نہیں کرتی جو اس سے محبت کرتا ہے۔

"Nature never betray that love her." [3]

(سچے دل سے پیار کرنے والوں کو فطرت مایوس نہیں کرتی۔)

فطرت علم، سکون اور روحانی تسکین کا ذریعہ ہے۔ ورڈزورتھ کی شاعری اس کی فطرت سے محبت، عقیدت اور فطرت پر اعتماد کا مظہر ہے۔ فطرت کے اس عظیم شاعر کے بقول فطرت ایک مقدس طاقت ہے جو فرحت بخش اور ذہن اور روح کے لیے باعث تسکین ہے۔

For oft, when on my couch I lie
In vacant or in pensive mood,
They flash upon that inward eye
Which is the bliss of solitude

And then my heart with pleasure fills,

And dances with the daffodils. [۴]

فطرت علم، سکون اور روحانی تسکین کا ذریعہ ہے۔ ورڈز ورتھ کی شاعری اس کی فطرت سے محبت، عقیدت اور فطرت پر اعتماد کا مظہر ہے۔ فطرت کے اس عظیم شاعر کے بقول فطرت ایک مقدس طاقت ہے جو فرحت بخش اور ذہن اور روح کے لیے باعث تسکین ہے۔ محبت اور فطرت کے شاعر نے فطرت کو ایک استاد کے تناظر میں بھی دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت ہمیں سادگی، محبت اور ہمدردی سکھاتی ہے۔ فطرت انسان کی روحانی، ذہنی اور اخلاقی تربیت کرتی ہے۔ بچوں، بچپن اور فطرت کے تعلق پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اپنی نظم میں وہ کہتا ہے کہ بچے جنت سے آتے ہیں۔ اس کے مطابق بچپن اور فطرت ایک دوسرے کے مخلص دوست ہیں۔ بچے فطرت کے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور ان کا دل اور ذہن بھی فطرت کی طرح پاکیزہ، خالص اور سچا ہوتا ہے۔ ورڈز ورتھ کہتا ہے:

"Heaven lies about us in our infancy." [۵]

(بچپن میں ہمارے ارد گرد جنت ہوتی ہے۔)

بچے فطرت سے فطرتی طور پر جڑے ہوتے ہیں۔ جلدی راضی ہونے والے، گورے کالے، امیر غریب سبھی کو ایک ہی نظر سے دیکھنے والے اور من کے سچے ہوتے ہیں۔ ولیم ورڈز ورتھ کے دور کی رومانوی تحریک کے ہم عصر شعرا کولرج اور شیلے نے بھی فطرت کو شخصیت سازی کا ذریعہ بنایا۔

سیمیوئل ٹیلر کولرج (۱۸۳۰ء۔ ۱۷۹۸ء) ولیم ورڈز ورتھ کا ہم آواز تھا۔ کولرج کے مطابق فطرت خوب صورتی اور تسکین کے ساتھ ساتھ تخیلاتی اور روحانی تجربہ بھی ہے۔ وہ بھی فطرت کو اخلاقی استاد کے طور پر دیکھتا ہے۔ قدرتی مظاہر سے نرمی، ہمدردی، سچائی، توبہ اور احساسِ زیاں کی تربیت ملتی ہے۔ کولرج کے مطابق فطرت انسان کو سزا اور رحمت دونوں دے سکتی ہے البتہ اس کا انحصار انسانی رویے پر ہے۔ کولرج نے کہا کہ فطرت سے خدا کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے جب کہ ولیم ورڈز ورتھ فطرت کو صرف سکون اور رحمت کے طور پر دیکھتا ہے۔

کولرج کی مشہور نظم Frost at midnight ملاحظہ کیجیے:

The trees stand tall in whispered night,

Their leaves aglow with silver light.

The Owls call out in haunting tune,

Beneath the gaze of watchful moon.

The breeze moves through moss and pine,

As stars above in silence shine.

A secret world, so still, so deep

Where ancient shadows softly sleep.[۶]

ان اشعار میں کولرج ہمیں فطرت کی پر اسرار اور روحانی دنیا سے روشناس کرواتا ہے جو بے حد خوب صورت ہے اور اکثر یہ خوب صورت دنیا انسان کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ اگر ہم فطرت کے حُسن پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ اسے محسوس کریں خاص طور پر رات کے وقت تو فطرت ہمیں روحانی دنیا سے روشناس کرواتی ہے۔ یہ نظم ہمیں فطرت کے احترام کا درس بھی دیتی ہے۔ فطرت یادوں، خاموشی اور روحانی تجربات کا امتزاج ہے اس نے یہ نظم اپنے بچے کے لیے تحریر کی جس میں اس نے فطرت کو روحانی استاد کے طور پر پیش کیا ہے۔

رومانوی تحریک کا ایک برطانیہ نژاد شاعر پی۔بی شیلے (Percy Bysshe Shelley) جو فطرت کو تبدیلی، آزادی اور حیاتِ نو کی علامت سمجھتا ہے۔ وہ فطرت کے دوہرے کردار کا قائل تھا۔ "Ode to west wind" شیلے کی یہ نظم فطرت کے اسی دوہرے کردار کے متعلق ہے یعنی کبھی زندگی دینے اور کبھی تباہ کرنے والی۔ فطرت نئی زندگی کو جنم دیتی ہے اس لیے پرانی چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ یعنی خزاں بہار کے لیے ہے۔ شیلے فطرت کی ابدی خوب صورتی کا قائل ہے۔ اس کی نظم "To a sky lark" ایک بلند پرواز کرنے والے نغمہ سرا پرندے سے متعلق ہے جسے نہ ماضی کا دکھ ہے نہ مستقبل کا خوف ہے۔ یہ نظم فطرت کی اعلیٰ پاکیزہ اور خوب صورتی کی علامت ہے۔

The pale purple even

Melts around the flight

Like a star of heaven

In the broad daylight

Thou art unseen but yet I hear

Thy shrill delight.[۷]

(شفق کی زرد روشنی تیری پرواز کے گرد گھل جاتی ہے۔ تیری پرواز انتہائی بلند ہے۔
تو آسمان میں پوشیدہ کسی ستارے کی طرح ہے۔ تو دن کی روشنی میں نظر نہیں آتا مگر
تیرے نغمے کی آواز میں سن سکتا ہوں۔)

شیلے کے نزدیک فطرتی مظاہر چرند، پرند، ہوائیں، بادلِ، سورج اور یہ سب آزادی اور حیات نو کی علامت ہیں۔ ولیم ورڈزورتھ نے معصوم فطرت کا انتخاب کیا۔ پر سکون وادیاں، پر شکوہ کہسار، باغات، پھول اور لہلہاتے کھیت وغیرہ وہ

فطرت کا دلدادہ تھا جب کہ شیلے اور کولرج نے فطرت کے غضب بپھرے سمندروں، گرجدار بادلوں اور طوفانوں کو بھی مدّ نظر رکھا۔

جان کیٹس (John Keats)نے مختلف ،پرندوں ، درختوں اور خزاں پر شاعری کی اوررابرٹ فراسٹ (Robert Frost)نے فطرت کے متعلق بے شمار نظمیں لکھی اس طرح لارڈ بائرن(Lord Byron)کو دریا سمندروں اور پہاڑوں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ ایملیڈ چنسن(Emily Dickinson) نے پرندوں باغوں اور محبت کے متعلق مشہور نظمیں لکھیں۔ اُردو ادب میں فطرت کے متعلق شاعری کے حوالے سے علامہ اقبال، مرزا غالب، اختر شیرانی، فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، حبیب جالب، اکبر الہ آبادی، پروین شاکر اور سید محسن نقوی کے نام بہت نمایاں ہیں۔

۱۸۹۷ء سے لے کر ۱۹۲۳ء تک کی درمیانی مدت میں فطرت پسندی کے متعلق تحریر کی گئی نظموں نے علامہ اقبال کو فطرت پسند شاعر کے طور پر ادبی دنیا میں متعارف کروایا۔ ان کو فطرت نگاری میں کمال حاصل تھا۔ اس حوالے سے اِن کی شہکار نظموں میں "چاند اور تارے" ، "ماں کا خواب"، "ہمدردی"، "حُسن و عشق"، "صبح کا ستارہ"، "ہمدردی"، "ایک شام"، "آفتابِ صبح"، "ہمالہ"، "کنار راوی"، "ابر کوہسار"، "شمع اور شاعر"، "خضر راہ"، "انسان اور بزمِ قدرت"، "پرندے کی فریاد"، "ایک پہاڑ اور گلہری"، "پیامِ صبح"، "جگنو"، "شبنم اور ستارے" وغیرہ۔

اس ضمن میں علامہ اقبال کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا[۸]

؎ اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے
ہر صبح نئے تجھ کو میّسر ہیں نظارے[۹]

علامہ اقبال نے مظاہر قدرت کو زندہ علامات کے طور پر دیکھا ہے اور انھیں بہت خوب صورتی سے مختلف انسانی رویوں کی سوجھ بوجھ، ادراک اور تشریح کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ مظاہر قدرت کو بہت غور و فکر کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک علمِ فطرت اور علمِ تاریخ انسانی علم کے دو بڑے ذریعے ہیں۔ وہ راوی کے کنارے غروبِ آفتاب کے ایک پر جلال منظر کے مقابلے میں کتب خانے کے سارے حیرت انگیز کتابی علم کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں فطرت، عمل اور حرکت کا سبق ہے۔ مرزا غالب محبت، حُسن اور فطرت کے شاعر تھے۔ اُن کے کلام میں فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔

غالب سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے[10]

ماہرِ لسانیات اور محقق محمود شیرانی کے بیٹے اختر شیرانی ایک رومانوی شاعر تھے۔اُن کی شاعری میں فطرت کے رنگ نمایاں ہیں وہ پھول، سبزہ زاروں اور چاند تاروں کو انسان کے جذبات سے متصل کرتے ہیں۔"طلسمِ حیات"،" آہنگِ محبت"،"انجامِ محبت " ،"شبنم اور سراب "،"حدیقہِ محبت"اُن کی مشہور کتب ہیں۔ اُن کی نظم "جگنو"کا ایک شعر ہے۔

ے ستارہ سا چمکتا ہے فضا میں
شرارہ اُڑتا پھرتا ہے ہوا میں[11]

فیض احمد فیض نے خزاں، بہار، بلبل، پھول، چاندنی اور فطرت کے دیگر ط مظاہر کو اپنی انقلابی شاعری میں استعمال کیا اُن کی شاعری فطرت اور انقلاب کا امتزاج ہے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے[12]

اس طرح حبیب جالب جن کی شناخت خاص طور پر انقلابی شاعری ہے اُن کے اشعار میں بھی فطرت کے رنگ نظر آتے ہیں۔ فطرت پسند شاعر نظیر اکبر آبادی نے مظاہر قدرت، حیوانات، نباتات، پرندوں، مختلف موسموں، پھلوں، کھیلوں اور میلوں کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ فطرت پسندی کے رویے کے اولین شاعر تھے۔ اُن کی مقبول نظمیں "آدمی نامہ"، "روٹیاں" اور "بنجارہ نامہ" ہیں۔ نثر نگاروں نے بھی اپنی تحریروں کو فطرت کے حُسن سے مزّین کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جدید دور کے بڑے افسانہ نگار تھے اُن کے افسانے "انجمن" ، "گندم کے کھیت" اور "بزرگ" فطرت اور دیہی زندگی کے عکاس ہیں۔ ابوالکلام آزاد کی تصانیف غبارِ خاطر اور تذکرہ میں فطرت نگاری کی جھلک نظر آتی ہے انھوں نے فطرت کو روحانی اور جمالیاتی تناظر میں پیش کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی تصانیف آبِ حیات میں فطرت کے رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔ سر سید احمد خان نے مذہب اور سائنس کو فطرت کے قوانین سے جوڑنے کی کوشش کی۔ آثارِ قدیمہ پر لکھی گئی مشہور کتاب آثارَ الصنادید میں انھوں نے فطرت اور ماحول پر بہت کچھ لکھا۔ پطرس بخاری کی تحریر کشمیر فطرت پسندی کی عمدہ مثال ہے۔ مشہور

مورخ اور ادیب ابو لفضل مغل سلطنت کے بادشاہ اکبر کا درباری تھا انھوں نے اپنی کتب أئین اکبری اور اکبر نامہ میں فطرت کے مظاہر باغات، درختوں، جنگلی حیات، پانی، زمین، اور فضا کے بارے میں بہت لکھا۔ کرشن چندر کے افسانے گل پاشی"، "کاغذی ہے پیرہن" اور "غدار" بھی دیہی زندگی اور فطرت کے حوالے سے عمدہ تحریریں ہیں سید رفیق حسین (۱۹۴۴ء تا ۱۸۹۴ء) اردو کے فطرت پسند افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں پرورش پائی۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں منفرد اور یادگار افسانے لکھے۔ ان کے افسانے فطرت نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ ان افسانوں میں جانوروں کی جبلت، نفسیات اور انسانوں کے ساتھ ان کے باہمی تعلق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جنگلات اور دیگر مظاہر قدرت کا بھی ان افسانوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا افسانہ "آئینۂ حیرت" چار ابواب پر مشتمل طویل اور مشہور افسانہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک امیر شخص قریشی صاحب ہیں جو ایک بندریا کے بچے کو جنگل سے اٹھا کر اپنے گھر میں لاتا ہے وہ بندریا کی بے چینی اور دکھ کی پرواہ نہیں کرتا اور اسے اس کی ماں سے جدا کر کے اپنے پاس قید رکھتا ہے۔ انتقام کے طور پر بندریا اس امیر آدمی کے بچے کو اٹھا کر جنگل میں لے جاتی ہے۔ اس طرح جنگلی حیات اور انسان کی کش مکش کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ افسانہ قدرتی دنیا سے متعلق انسان کے برے رویے اور انسانی بے حسی کے بارے میں تحریر کیا گیا۔ افسانہ "بے زبان" ایک گونگی لڑکی اور ایک گھوڑی کے درمیان دوستی اور محبت کی کہانی ہے۔ دونوں بے زبان ہیں مگر ان کے درمیان محبت اور گہری دوستی ہے۔ یہ افسانہ فطرت، بے زبان حیات سے محبت اور ہمدردی کا درس دیتا ہے۔ افسانہ "شیریں فرہاد" ایک بلے اور بلی کا قصہ ہے۔ بلی بہت وفادار ہوتی ہے جب کہ بلا بے وفا ہوتا ہے۔ اس کہانی کے تناظر میں مصنف فطرت کے ساتھ انسانی رویوں اور معاشرتی تضادات کی نشان دہی کرتا ہے۔ افسانہ "کلوّا" کا موضوع ایک کتا ہے جس کو وفا اور محبت کی علامت کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اس کہانی میں ایک سخت مزاج والد غصے میں اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ جب بہت عرصہ وہ واپس نہیں آتا تو والدین بچے کی جدائی کی وجہ سے مضطرب رہتے ہیں ان کا کتا 'کلوا' اس کو ڈھونڈنے نکلتا ہے اور آخر میں وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دیتا ہے۔ افسانہ "کفارہ" رفیق حسین کی فطرت پسندی اور فطرت کے گہرے مطالعے کا مظہر ہے۔ انھوں نے اس افسانے میں برصغیر کے ایک مقام کا بھی ذکر کیا جہاں وسیع رقبے پر جنگلات ہیں درخت بلند قامت، سرسبز و شاداب مضبوط تنوں پر مشتمل، سایہ دار اور مسافر نواز ہیں۔

فطرت کے متعلق شعور و آگاہی کے حوالے سے حضرت علی کرم اللہ وجھہ کے مشاہدات:

حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں فطرت کے متعلق شعوراور آگاہی کے حوالے سے مشاہدات کا جزئیات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند قدرت کے مظاہر کا بیان یہاں شامل کیا جارہا ہے۔ زمین کے متعلق انھوں نے بیان کیا ہے کہ:

ے"بلند چوٹیوں اور پتھروں کی مضبوط چٹانوں پتھریلے پہاڑوں سے زمین کی حرکت میں اعتدال پیدا ہوا۔ زمین سے فضائے بسیط تک پھیلاؤ اور وسعت رکھی گئی۔ زمین کے باسیوں کو سانس لینے کو ہوا مہیا کی نیز ان کی تمام ضروریات کے ساتھ ٹھہرایا گیا۔ پھر چٹیل زمینوں کو کہ جن کی بلندیوں تک نہ نہروں کے نالے پہنچ سکتے ہیں نہ چشموں کا پانی۔ قدرت نے ان پر ہوا پر اٹھنے والی کالی گھٹائیں پیدا کیں۔ جب بادلوں نے اپنا سینہ ہاتھ پاؤں سمیت زمین پر ٹیک دیا اور پانی کا سارا بوجھ اس پر گرادیا تو افتادہ زمینوں سے سرسبز کھیتیاں اُگ آئیں اور خشک پہاڑوں پر ہرا بھرا سبزہ پیدا ہوا۔ زمین بھی اپنے مرغزاروں کے بناؤ سنگھار سے جھومنے لگی اور اُن شگوفوں کی اوڑھنیوں سے جو اسے اوڑھادی گئی تھیں اور ان شگفتہ و شاداب کلیوں کے زیوروں سے جو اسے پہنا دیے گئے، (زمین) اترانے لگی۔ ان چیزوں کو خلق کرنے والے نے انسانوں کی زندگی کا وسیلہ اور چوپایوں کا رزق قرار دیا۔"[۱۳]

آسمان کے متعلق کہا:

ے"آسمان اس طرح قائم کیا کہ ستونوں کی سہارے کی ضرورت نہ بندھنوں سے باندھنے کی حاجت ہے۔ پھر آسمان کو ستاروں کی سج دھج اور روشنی کی چمک دمک سے آراستہ کیا۔ اُن میں ضوپاش چراغ اور جگمگاتا چاند رواں کیا۔"[۱۴]

چیونٹی کے متعلق کہا:

ے "چیونٹی کی جسامت کے اختصار اور شکل وصورت پر غور و فکر سے مشاہدہ کرو۔ یہ اتنی چھوٹی ہے کہ گوشہ چشم سے بمشکل دیکھی جاسکتی ہے نہ ہی فکروں میں سماتی ہے۔ دیکھو زمین پر کیسے رینگتی پھرتی ہے اور اپنے رزق کی طرف لپکتی ہے۔ پھر دانے کو اپنے بل میں لے جاکر اپنے مسکن میں مہیا رکھتی ہے۔ گرمیوں میں جاڑے کے موسم کے لیے اور قوت و توانائی کے زمانے میں عجز و درماندگی کے دنوں کے لیے خوراک کا ذخیرہ اکٹھا کر لیتی ہے۔ اگر تم چیونٹی کی غذا کی نالیوں اور اس کے بلند و پست حصوں اور اس کے خول میں پیٹ کی طرف جھکے ہوئے پسلیوں کے کناروں اور اس کے سر پر چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور کانوں کی ساخت پر غور و فکر کروگے تو اس کی آفرینش پر تمھیں تعجب ہوگا۔ اس طرح اس کے وصف اور خوبیاں دیکھ کر بھی حیرت ہوگی۔ چیونٹی اور

کھجور کے درخت نیز دیگر ذی حیات کے مختلف اعضا میں باریک سا فرق ہے۔ مخلوقات میں بڑی چھوٹی، بھاری ہلکی، طاقت ور کمزور، سب یکساں ہیں اور یوں ہی آسمان، فضا اور ہوا اور پانی سب برابر ہیں۔"[۱۵]

بلاشبہ چیونٹی ایک چھوٹی سی مخلوق ہے۔ یہ شعور اور احساس کی قوت سے مالامال ہے۔ جہاں خوراک ہو یہ دور سے سونگھ کر محسوس کر لیتی ہے۔ یہ اپنی کمزور ٹانگوں پر خود سے بیس گنا زیادہ وزن اٹھا سکتی ہے۔ اگر وزن اس سے زیادہ ہو تو ساتھی چیونٹیوں کو مدد کے لیے بلاتی ہے اور پھر سب مل کر غذا کو مسکن تک لے کے جاتی ہیں۔ بلندی پر چڑھتے ہوئے بوجھ جتنی مرتبہ گر جائے اتنی مرتبہ یہ دوبارہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے۔ ہر موسم میں خوراک کے لیے سر گرم رہتی ہے۔ بارش کے پانی سے محفوظ رکھنے کے لیے بِل میں بَل کھاتے ٹیڑھے میڑھے راستے بناتی ہے۔ گرمیوں میں خوراک کے ذخیرے کو خشک کرتی ہے تاکہ بل میں گل سڑ نہ جائے۔ اس کے علاوہ ہر دانے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے تاکہ یہ زمین میں اُگ نہ سکیں۔ یہ تین حصوں پر مشتمل گھر بناتی ہے۔ ایک میں خود رہتی ہے، دوسرے میں انڈے دیتی ہے اور تیسرے میں خوراک ذخیرہ کرتی ہے۔ اپنے مسکن کو نمی سے بچانے کے لیے پرندوں کی طرح بھوسے کے تنکے بچھا دیتی ہے۔ ان میں نظم و ضبط ہوتا ہے اور یہ مل جل کر کام کرتی ہیں۔ علامہ اقبال، ولیم ورڈز ورتھ، شیلے، کولرج اور دیگر ادیب فطرت کو بطور اتالیق کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو بچے اس چھوٹی سی مخلوق (چیونٹی) سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

مور کے بارے میں کہا کہ:

"پرندوں میں عجیب الخلقت ہے قدرت نے ایسے دلکش رنگوں سے مزّین کیا ہے۔ جب یہ مادہ کی طرف بڑھتا ہے تو اس دُم دور تک کھینچی چلی جاتی ہے اور وہ ایسے اونچا کرتے ہوئے پھیلا دیتا ہے۔ یہ اس کے سر پر سایہ فگن ہو کر پھیل جاتی ہے گویا وہ مقام دارین کی اس کشتی کا بادبان ہے جسے ملاح اِدھر اُدھر موڑ رہا ہو۔ مور اپنے رنگوں پر نازہے۔ اس کے پروں پر سورج کی کرنوں کی مانند ہالے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے پر و بال کے رنگوں کو خالص سونا اور زمرد کے ٹکڑے خیال کرو گے۔ اگر زمین میں پیدا کرنے والے رنگوں سے تشبیہ دو گے تو کہو گے کہ وہ موسمِ بہار کے چنے ہوئے شگوفوں کا گلدستہ ہے۔ اگر ملبوسات سے تشبیہ دو گے تو نقش و نگار والا حلّول یا خوش نما یمنی چادر کی مانند ہے۔ اگر زیورات سے تشبیہ دو گے تو وہ ان خوش رنگ نگینوں کی طرح ہے جو مرصع بجواہر چاندی میں دائروں کی صورت میں پھیلا دیے گئے ہوں۔ وہ ہشاش بشاش ہو کر ایسے چلتا ہے جیسے متکبر محو خرام ہو۔ جب اپنے حُسن و جمال پر غور کرتا ہے تو مسکراتا ہے مگر جب اپنے پاؤں پر نظر کرتا ہے تو گویا اپنی فریاد کو ظاہر کرتا ہے۔ مور کی رنگینی ان بکھری ہوئی

کلیوں کی مانند ہے مگر ایسی کلیاں جن کو نہ فصل بہار کی بارشوں نے پروان چڑھایا ہو نہ سورج کی روشنی نے ان کی پرورش کی ہو۔ اس کے بال و پر یوں جھڑتے ہیں جیسے خزاں میں پتے۔ اس طرح وہ اپنے رنگین لباس سے بے لباس ہو جاتا ہے اور جب دوبارہ بال و پر آتے ہیں تو پہلے والے رنگوں کی ترتیب سے آتے ہیں۔ جب ان پر غور کیا جائے تو کبھی گلاب جیسی سرخی، کبھی زمرد جیسی سبزی اور کبھی سونے جیسی زردی جیسے رنگوں کی جھلک دکھائی دے گی۔"[16]

چمگادڑ کے متعلق کہا:

"اُجالا اُن کی آنکھوں کو تنگ کرتا ہے حالاں کہ اُجالا تمام آنکھوں میں روشنی پھیلانے والا ہے اندھیرا ان کی آنکھوں کو کھول دیتا ہے جب کہ اندھیرا ہر ذی روح کی آنکھوں پہ نقاب ڈالنے والا ہے۔ گویا دن کے وقت ان کی پلکیں ان کی آنکھوں پر لٹک آتی ہیں اور شب کی تاریکی کو چراغ بنا کر چمگادڑ اپنا رزق تلاش کرتی ہے۔ یہ (چھلی نما) گوشت کے پروں سے اڑتی ہے جو نہ اتنے باریک ہیں کہ پھٹ جائیں اور نہ اتنے موٹے ہیں کہ اڑنے کے لیے بوجھل ہو جائیں۔ چمگادڑ جب اڑان بھرتی ہے تو اس کے بچے اس سے چمٹے رہتے ہیں، اُس وقت تک کہ جب تک چمگادڑ کے بچوں کے پَر مضبوط ہو کر اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں"۔[17]

فطرت کے متعلق شعور اور آگاہی کے حوالے سے حضرت علی کا یہ علمی کلام ان کے گہرے مشاہدے اور وسیع علم پر مبنی ہے۔ انھوں نے ان جانداروں کی تمام خصوصیات کو بہت باریکی سے بیان کیا ہے۔ ان کا یہ گہرا مشاہدہ کولریج کے قول "فطرت ایک روحانی تجربہ ہے" کے مصداق ہے۔

فطرت کا جمالیاتی تکلم:

فطرت اپنے مقام پر انسانی خمیر میں پائے جانے والے اخلاص کی منتظر رہتی ہے لیکن اس کی نگاہیں جو محض حیاتیاتی غرض مندی اور حیوانی تحیر سے لبریز ہوں، اس قابل نہیں ہو سکتیں کہ حُسنِ فطرت کا شائبہ پا سکیں۔ فطری ہیئتوں کی تفہیم کے لیے مصوری کے قوانین تناظر کو اصولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ قوانین نگاہوں کو اس قدر مشتاق اور معاملہ فہم بنا دیتے ہیں کہ وہ فطرت سے ہم کلام ہو سکیں۔ شاعری فطرت کا سامنا کرتے ہی اس میں تحلیل ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ فطرت اپنے غالب مفہوم میں خاموش عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فطرت کی ناقابل پیمائش وسعتوں میں آواز، آبشاروں کی گنگناہٹ، پرندوں کی بولیاں اور خوش بو ایسے عناصر نایاب ہیں۔ فطرت سونگھنے یا سننے سے زیادہ دیکھنے کے لائق ہے۔ زوار حسین ایک خطاط، مصور اور مجسمہ ساز تھے۔ نثری نظم میں اُن کا شمار اوّلین نمائندوں میں ہوتا ہے۔ "حروف"، "اکیلی ہوا" اور "شاخ ویرانہ دل" اُن کی یادگار تصانیف ہیں۔ ملتان آرٹس کونسل کی گیلری کا نام زوار حسین سے منسوب ہے۔ جولائی ۱۹۹۲ء کے ایک ادبی رسالے "ماہِ نو" میں زوار حسین کا ایک

مضمون فطرت کا جمالیاتی تکلم کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۹۲ء میں ادبی حلقے ماحولیاتی تنقید اور فطرت کے جمالیاتی تکلم جیسے موضوعات کے بارے میں اپنی ادبی ذمے داریوں سے آشنا تھے۔ ذیل میں اسی مضمون سے اقتباس پیش کیا گیا ہے:

> "انسان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے کلام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی بات فطرت پر بھی صادق آتی ہے۔ کلام اور اس کے ابلاغ کے لیے لازم آتا ہے کہ سامع اور متکلم ایک متوازی سطح پر موجود ہوں۔ لیکن یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ انسان اپنے ارتقا کے انتہائی مقامات پر بھی فطرت سے ہم کلام ہونے کا مستحق نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب تربیت کی خامی اور اعلیٰ نظری صلاحیتوں کا عدم استعمال ہے۔ صرف یہی نہیں کہ انسان ابھی فطرت کا دوست یا قدر دان نہیں بن سکا بلکہ اس نے اپنی ذات کے تخریبی عناصر کے باعث خود فطرت کے چہرے کو زخمی کر دیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ کرہ ارض کی حیاتیاتی فضا پہلی مرتبہ مکمل طور پر معرضِ خطر میں ہے۔ لہٰذا عہدِ موجود کا سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ انسان اپنی بینائی اور اس سے حاصل ہونے والی حقیقی بصیرت کو کس طرح بحال کرے؟"۔۔۔۔[۱۸]

بصارت اور سماعت سے محروم امریکی مصنفہ ہیلن کیلر Helen Keller(۱۹۶۸ء۔ ۱۸۸۰ء) اپنی مشہور تحریر Three days to see میں انسان کو اپنی حواس خمسہ کی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنے اور ان کی قدر کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے اگر مجھے صرف تین دن کے لیے بینائی مل جائے تو پہلے دن میں شفیق اور مہربان چہرے اور اپنے اساتذہ کو دیکھوں گی۔ دوسرے دن پھولوں پتیوں، حسین مناظر، چاندنی اور فطرت کی خوبصورتی کو دیکھوں گی۔ تیسرے دن لوگوں کی روزمرّہ سرگرمیاں دیکھوں گی۔ وہ خواہش ظاہر کرتی ہے کہ کاش میں ایک یونیورسٹی بنا سکتی جس میں یہ پڑھایا جاتا کہ آنکھوں کا استعمال کیسے کرنا ہے؟ وہ اپنی ایک دوست کے بارے میں افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ وہ جنگل میں سیر کر کے آئی اور کہا کہ جنگل میں کچھ خاص نہیں مجھے دیکھنے کو کچھ نہیں ملا۔ ہیلن کیلر اس کی بات پر افسوس کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ایک میں ہوں جو بصارت اور سمات سے محروم ہوں اور انھی انگلیوں سے چھو کر درختوں کو محسوس کرتی ہوں[۱۹]۔ انسان اور فطرت کے تعلق کو زوار حسین یوں بیان کرتے ہیں:

> "جدید دور کے شاعرانہ تصورات نے انسان اور فطرت کی جدائی پر بہت نوحہ گری کی ہے۔ فطرت کی طرف واپسی کا رومانوی میلان بھی اسی میں شامل ہے۔ انسان فطرت کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔ اس کا لمحاتی وصال چاہتا ہے یا تناظر۔۔۔؟ یہ سب ایسے مختلف سوالات ہیں جن کے نتائج یکساں قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ حقیقت میں تحلیل ہو جانا ضروری ہے یا پھر ایک فریق کی

حیثیت سے اس کے تناظر کو اہمیت دینی چاہیے؟ ایسے تصفیے خود انسان کے شعور ذات اور مجموعی طور پر مقدر انسانی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک شعور ذات کا تاریخی ماجرا ہے، اس سے مراد کسی ہستی کا اپنی ذاتی حدود، آزادی اور اختیار کو پورے طور پر سمجھنا ہے۔ یہ ایک زیادہ سے زیادہ مجتمع اور مرتکز ہونے کا ادراکی عمل ہے جو کسی بھی ہستی کو فطرت میں مدغم یا مخلوط ہونے کی بجائے تعلقاتی قسم کی علیحدگی کا درس دیتا ہے اور پھر یہ علیحدگی یوں لازم آتی ہے کہ اس کے بغیر فاصلے اور تناظر کا اصول کار فرما نہیں ہو سکتا۔ بلا شبہ عہد موجود کی میکانکی اشکال نے انسان کو فطرت سے جدا کرتے ہوئے مماثلت کی بجائے اختلاف پر زور دیا ہے لیکن یہ فاصلہ نادر الوقوع ہے کہ جس نے فطرت اور انسان کی حدود پر روشنی ڈالتے ہوئے مکالمے کی حقیقی شرائط کو پورا کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت انسان فطرت کے روبرو کم از کم فریق ثانی کے طور پر موجود ہے جب کہ باقی تمام فیصلے تکلم اور تناظر کی نوعیت پر منحصر ہیں کہ آئندہ تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی۔۔۔۔۔"؟[۲۰]

انسان اور فطرت صدیوں سے ہم سفر رہے ہیں مگر جدید مشنی دور میں انسان نے فطرت کو نظر انداز کیا نیز فطرت نے بھی انسان سے منہ موڑ لیا اس فراق پر جدید دور کے لکھاری بھی نوحہ کناں ہیں شاعرانہ تصوارت میں تو انسان فطرت سے رومانوی رشتے استوار رکھنا چاہتا ہے۔ یہ قدرت کی تقسیم ہے کہ انسان خود شکل و صورت مال و دولت اور علم و ہنر کے لحاظ سے ایک دوسرے مختلف ہے۔ یہ ہی علم و ہنر انسان کو ایک دوسرے انسان سے آگے لے جاتے ہیں یہ درست ہے کہ فطرت میں سب ایک جیسے نہیں ہو سکتے مگر ہر ایک کو اپنی محنت اور صلاحیت دکھانے کا برابر موقع ملنا چاہیئے۔ فطرت اور انسان میں ایک بنیادی فرق شعور و آگہی اور تخلیقی صلاحیتوں کا ہے دیگر جاندار اپنی فطرت کے مطابق صدیوں سے غاروں میں رہتے ہیں اس طرح پرندے تنکا تنکا چن کر آج بھی اپنا آشیانہ ویسے ہی بناتے ہیں جیسے صدیوں پہلے بناتے تھے مگر انسان غاروں سے نکل کر محلات اور بلند بالا عمارتوں میں جا بسا جانوروں سے کھینچے جانے والی گاڑیوں سے ہوائی جہاز پر سفر کرنے لگا لہذا تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے انسان خود کو فطرت کا حصہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ خود کو ایک آزاد اور خود مختار قوت کے طور پر دیکھتا ہے مگر فطرت کے ہر مظاہر کو بھی حقوق حاصل ہیں ماحول کا حق ہے کہ اُسے آلودہ نہ کیا جائے، جنگلی حیات کو آزاد اور زندہ رہنے کا حق ہے سبزہ زار، باغات پودے، چرند پرند، پانی اور ہوا سب انسان سے نالاں ہیں۔ مشینی دور کے انسان نے خود کو فطرت سے دور کر لیا ہے اپنی تحریر میں زوار حسین نے سوال کیا کہ فطرت اور انسان کے درمیان آئندہ تعلقات کی نوعیت کیا ہو گئی؟

تعلقات کی نوعیت یہ ہی ہے کہ انسان ماحولیاتی توازن برقرار نہ رکھ سکا تو فطرت نے بھی اپنی تیوری چڑھالی۔ موسمیاتی تبدیلی ناقابلِ برداشت درجہ حرارت، زلزلے، گلیشرز کا پگھلنا، بادلوں کا پھٹنا، آسمانی بجلی سے اموات میں اضافہ اور موسمِ بہار کا روٹھ جانا یہ سب فطرت کی ناراضگی کا اظہار ہے۔

ماحول:

ماحول کے معنی بہت وسیع ہیں۔ عام طور پر ماحول سے مراد گرد و نواح کے طبعی اور ثقافتی حالات ہیں۔ انسان کا گھر، اس کے آس پاس موجود ندی، نالے، تالاب، کھیت کھلیان، جنگلات، میدان، صحرا، پہاڑ، باغات، عمارتیں اور سڑکیں وغیرہ سب ہی ماحول کے اجزا ہیں۔ صحن میں لگا ہوا امرود یا جامن کا درخت، یا صحن میں لگی ہوئی گھاس اس کے مکینوں کے لیے اتنے ہی اہم عناصر ہیں جتنے ان کے آرام کرنے کے کمرے ہیں۔ انسانی طرز زندگی پر اس کا ماحول براہ راست اثر کرتا ہے۔ بہت سے لوگ میدانی علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ میدانی علاقوں کے لوگوں کے لیے مٹی اور پانی وافر مقدار میں دستیاب ہوتا ہے جس کی بدولت وہاں کے زیادہ تر لوگ زراعت کے شعبے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ پہاڑی علاقوں میں زندگی گزارتے ہیں وہ لکڑی کاٹتے اور جانور پالتے ہیں۔ وادیوں میں رہنے والے کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں اور اسی طرح ساحلی علاقوں کے لوگ ماہی گیری کر کے گزر بسر کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ انسان جہاں مقیم ہوتا ہے وہاں کے ماحول، آب و ہوا اور وسائل کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔

انسان کو خدا نے عقل جیسی نعمت سے نوازا ہے اور اسے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے جب کہ جانور اس نعمت سے محروم ہیں۔ وہ نہ تو کوئی چیز تخلیق کر سکتے ہیں اور نہ ہی ایجاد کر سکتے ہیں۔ انسان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے ماحول کو اپنے مطابق بدل سکتا ہے۔ وہ ایجاد بھی کر سکتا ہے اور تخلیق بھی۔ علامہ اقبال کے اشعار میں اس کا اظہار ملتا ہے:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدم
خیابان و گلزار و راغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ ساز[۲۱]

یعنی اے کائنات کے رب! تو نے رات بنائی تو میں نے روشنی کے لیے چراغ بنایا۔ تو نے مٹی بنائی تو میں نے اس سے اپنے مفاد کے لیے مٹی کے برتن بنا لیے۔ تو نے بیابان، پہاڑ اور صحرا بنائے، میں نے ان میں گلستان اور باغ تیار کیے۔ میں تو وہ ہوں جو پتھر سے شیشہ اور زہر سے تریاق بنالیتا ہوں۔

انسان کے گرد و نواح میں موجود درخت، چرند پرند، جانور، ہوا، پانی، برسات، آسمان، سورج، چاند، چاندنی، سردی، گرمی، بہار، خزاں، صبح، دوپہر، شام، مٹی اور اس کی خصوصیات، آس پاس بسنے والے لوگ اور انسان کی اپنی ذات، سب ماحول کہلاتا ہے۔ انسان اپنے ماحول کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کو کیسے خوشگوار بنا سکتا ہے اور مضر چیزوں سے اس کا تحفظ کیسے ممکن ہے؟ یہ ماحولیات کا علم کہلاتا ہے۔ قرآن مجید میں پر امن ماحول اور اس کے تحفظ سے متعلق مکمل رہنمائی ملتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (31) وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ [۲۲]

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے زمین پر مضبوط پہاڑ بنائے تاکہ زمین ادھر ادھر جھکنے نہ پائے اور زمین میں کشادہ راستے بنائے تاکہ انسان اپنی نقل و حرکت کر سکیں۔ اللہ نے انسان کے لیے آسمان کو ایک مضبوط چھت بنایا۔

انگریزی میں ماحول کی تعریف Christina A. Siry نے Robert Bullard کا حوالہ دیتے ہوئے کی ہے جس کی وضاحت یوں ہے:

> "The environment is everything, where we live, work, play, go to school, as well as the physical and natural world. And so, we cannot separate the physical environment from the cultural environment. We have to talk about making sure that justice is integrated throughout all the stuff that we do." [۲۳]

اس وضاحت کے مطابق ہماری زندگی کے تمام رویے تہذیب و ثقافت اور تمام متعلقات ماحول ہیں۔ جہاں ہم رہتے ہیں، کام کرتے ہیں، کھیلتے ہیں، اسکول جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ظاہری اور قدرتی دنیا بھی ماحول ہے تو ہم ظاہری ماحول کو ثقافتی ماحول سے الگ نہیں کر سکتے۔ غرض یہ کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ سب ماحول ہے۔

ماحول کی اقسام:

بنیادی طور پر ماحول کی دو بڑی اقسام ہیں:

۱۔ فطرتی یا قدرتی ماحول (Natural environment)

۲۔ مصنوعی یا انسانی خود ساختہ ماحول (Man made environment)

- فطرتی ماحول:(Natural environment)

قدرت کا تشکیل کردہ ماحول جو انسان کی دخل اندازی کے بغیر فطرتی طور پر موجود ہوتا ہے، قدرتی یا فطرتی ماحول کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین، پانی، ہوا، جنگلات، جانور، پہاڑ، دریا، سمندر، صحرا، دھند، بادل، بارش، پتھر، آگ اور مٹی وغیرہ۔

- انسانی خود ساختہ ماحول:(Man made environment)

انسانوں کا تشکیل کردہ ماحول جو انسان نے اپنی ضروریات کے لیے قدرتی وسائل کو استعمال کر کے خود تخلیق کیا ہو۔ مثال کے طور پر شہر اور دیہات کی ترتیب، عمارتیں، سڑکیں، گاڑیاں، مشینیں، کاروبار، معیشت، پیداوار، ذرائع آمد و رفت، ذرائع مواصلات اور سماجی نظام وغیرہ انسانی خود ساختہ ماحول ہے۔[۲۴]

ماحولیات:

علم ماحولیات (Ecology)حیاتیات کی ایک اہم شاخ ہے۔ اس میں پودوں اور جانوروں کی زندگی اور نشوونما کا سائنسی انداز میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ایکالوجی کی اصطلاح انیسویں صدی میں جرمن ماہر حیاتیات ارنسٹ ہیکل نے پہلی مرتبہ ۱۸۲۹ء میں استعمال کی۔ ان کے مطابق ایکالوجی دو یونانی الفاظ سے ماخوذ ہے۔ oikos کا مطلب گھر، رہائش گاہ یا کمیونٹی ہے جب کہ logos کے معنی مطالعہ یا گفتگو کے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایکالوجی کا مطلب(Study of house)یعنی گھر کا مطالعہ ہے، زمین تمام جانداروں کا مشترکہ گھر ہے اس لیے ارنسٹ ہیکل ماحول کے مطالعے کو دنیا کا مطالعہ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "Ecology is the study of the relationships between living organisms, including humans and their physical environment. It seeks to understand the viral connections between plants and animals and the world around them".[۲۵]

یعنی ایکالوجی جانداروں اور ان کے قدرتی ماحول کے مابین تعلقات کا مطالعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے ہم جانوروں، پودوں اور انسانوں کے درمیان بننے والے تعلق کو با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ڈکشنری آف سائنس کے مطابق ایکالوجی کی تعریف یوں ہے:

"ایکالوجی حیاتات کی وہ شاخ ہے جس میں پودوں پر ماحول کے اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جاندار روز مرہ کیا کام کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں؟ ماحولیات ماحولیاتی نظام کی پائیداری اور جانداروں کی بقا سے متعلق ایک اہم سائنسی میدان ہے۔"[۲۶]

فریڈرک سیمنڈ (Frederick Simonds) ایک معروف ماہر ماحولیات اور ماہر نباتات تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ایکالوجی کو ایک علاقے کی سائنس قرار دیا۔

یعنی ایکالوجی جانداروں کی کمیونٹی (جماعت) کا سائنسی مطالعہ ہے۔ فریڈرک کے مطابق جاندار تنہا نہیں رہتے بلکہ وہ دوسرے جانداروں کے ساتھ مل کر ایک مضبوط نظام بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگل میں جنگلی حیات، چرند پرند، کیڑے مکوڑے اور درخت سب مل کر ایک کمیونٹی بناتے ہیں۔ اس کمیونٹی میں سب ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ اگر کسی ایک کو تکلیف پہنچتی ہے تو باقی سب اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ فریڈرک جانداروں کے اس تعلق کو کمیونٹی اور اس کے سائنسی مطالعے کو ایکالوجی کا نام دیتے ہیں۔

چارلس ایلٹن (Charles Elton) نے ۱۹۱۴ء میں اسے سائنسی فطرت کی تاریخ قرار دیا۔

"Ecology is the scientific natural history".[۲۷]

چارلس ایلٹن کے مطابق ایکالوجی فطری دنیا کے مشاہدے پر مبنی ایک سائنسی علم ہے جو جانداروں اور ان کے ماحول کے مابین تعلقات کو سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ جانداروں اور ان کے ماحول میں آنے والی تبدیلیوں کو پرکھتا ہے۔

وارڈر کلائیڈ ایلی (Warder Clyde Alee) ایک امریکی ماہر ماحولیات اور ماہر حیوانیات تھے۔ ایلی کو خاص طور پر جانوروں کے جھنڈ بنا کر رہنے، سماجی رویوں اور آبی و زمینی ماحول میں ان کی تفہیم پر تحقیق کے لیے پہچانا جاتا ہے۔ انھوں نے ایکالوجی پر ۱۹۴۹ء میں کام کیا۔ ان کے مطابق:

"The natural environment is not a collection of separate things. It is a system of interrelationship".[۲۸]

یعنی فطری ماحول الگ الگ اشیا کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ باہمی تعلقات کا نظام ہے۔ ہم قدرتی عناصر جیسے درخت، پودے، جانور، پانی اور مٹی کو الگ نہیں کر سکتے۔ یہ تمام اجزا ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ اگر کسی ایک عنصر میں بھی بگاڑ پیدا ہو جائے تو اس کے اثرات پورے ماحولیاتی نظام پر مرتب ہوں گے۔ اگر انسان فطری نظام میں بے

جامد اخلت کرتا ہے تو وہ خود اپنی بقا کو خطرے سے دوچار کرتا ہے۔ قومی اردو انگریزی لغت میں ایکالوجی کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"ماحولیات (ایکالوجی) حیاتیات کی ایک شاخ ہے جس میں (Biotic)یعنی نباتات، حیوانات، انسان اور (Abotic) غیر جاندار چیزوں مثلاً پانی، ہوا، مٹی، سورج اور روشنی وغیرہ ہر دو کے مجموعی ماحول میں باہمی تعلق کا مطالعہ کیا جاتا ہے"۔[۲۹]

این۔ ایس سبرامنیان این. ایس Subrahmanyan N.S کے مطابق جانداروں کے ماحول کے ساتھ مطابقت اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقوں کا مطالعہ ایکالوجی کہلاتا ہے۔ ادبی تنقید میں اس کو ایکو کریٹیسزم Ecocriticism کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور اردو میں اس کی اصطلاح ماحولیاتی تنقید کے نام سے ہوئی۔

ماحولیاتی تنقید (Ecocriticism):

ماحولیاتی تنقید ادب اور فطری دنیا کے مابین رشتوں کے مطالعے سے ان معانی تک رسائی حاصل کرتی ہے جن کا منبع فطرت ہے۔ دیگر تنقیدی نظریات کے مطالعہ کا محور سماجی، نفسیاتی، ثقافتی اور لسانی ہے جب کہ ماحولیاتی تنقید کا نقطہ ارتکاز اور محور فطرت، زمین اور ماحول ہے۔ ماحولیاتی تنقید نئے تنقیدی نظریات میں سے ایک نظریہ ہے جس کو انگریزی میں (Ecocriticism) کہتے ہیں۔ اس کی ابتدا ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں ولیم رئیکرٹ نے ماحولیاتی تنقید کی اصطلاح اپنے مقالے "ادب، ماحولیات اور ماحولیاتی تنقیدمیں ایک تجربہ" میں استعمال کی تھی۔[۳۰]

ماحولیاتی تنقید ایک تحریک ہے جس کا بنیادی مقصد فطری ماحول کو انسانی استحصال اور دست درازی سے بچانا اور اس سلسلے میں ان میں شعور اور آگاہی پیدا کرنا ہے تاکہ ان کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کیا جاسکے۔ ماحولیاتی تنقید فطرت کی بحالی پر زور دیتی ہے نیز یہ بھی مصنف کی ذاتی زندگی میں ان محرکات کی کھوج لگاتی ہے جو اس کے تخلیق و تجربے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ماحولیاتی تنقید میں مختلف انواع کی علامتی تشکیل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید فطرت پر انسان کے غلبے اور انسان کے ہاتھوں فطرت کے استحصال پر توجہ مرکوز کرتی ہے یعنی انسان نے سمندروں اور فضاؤں کو کیسے آلودہ کیا اور کیسے پہاڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔

ماحولیاتی تنقید ماحولیاتی انصاف (Ecobalance) اور فطرت کے یکساں احترام کی مخلصانہ کوشش ہے جس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو عمارتی لکڑی اور ایندھن درکار ہے، درختوں سے آپ نے دوسری ضروریات بھی پوری کرنی ہیں، نئے گھر بنانے ہیں لہٰذا درختوں اور جنگلوں کی کٹائی ناگزیر ہے مگر ماحولیاتی انصاف اور فطرت کا یکساں احترام یہ ہے کہ آپ درختوں کی افزائش، آبیاری اور حفاظت کا بھی بندوبست کریں۔ کارخانے، فیکٹریاں اور گاڑیاں چلیں مگر زہریلی گیسوں کے اخراج کو روکنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ مصنوعی روشنیاں انسان کی ضرورت ہیں جس کی وجہ سے شہر جگمگا رہے ہیں مگر جگنو اس مصنوعی روشنی کی وجہ سے اپنے ساتھی سے بچھڑ جاتے ہیں۔ جگنو کو چاند اور تاروں بھری رات چاہیے۔ ہمیں فطرت کی اس انمول نشانی کو بھی معدوم ہونے سے بچانا ہے۔ اسی طرح انسان کو پھولوں کی ضرورت ہے، وہ پھولوں کو مختلف مقاصد کے لیے توڑتا ہے۔ کبھی سہرے کے لیے، کبھی گجرے کے لیے، کبھی جوڑے میں اور کبھی کوٹ میں سجانے کے لیے، کبھی قبروں کی زینت کے لیے اور محبت کے اظہار کے لیے، کبھی مہمانوں کی آمد پر پھول برسائے گا اور پھر یہ ہی پھول پاؤں تلے مثل دیے جاتے ہیں، کبھی کتابوں میں رکھے جاتے ہیں اسی طرح مختلف خوشبوئیں اور عرق بنانے کے لیے پھولوں کا استعمال کیا جاتا ہے مگر ماحولیاتی انصاف اور فطرت کا احترام یہ ہے کہ ہم گملوں اور کیاریوں سے لے کر پارکوں اور باغات تک پھولوں کی افزائش اور حفاظت کا دائرہ وسیع کریں۔ اور اپنے گھروں، گلیوں اور وطن کو پھولوں اور بلبلوں کا شہر شہر از بنادیں۔

ماحولیاتی انصاف ماحولیاتی تنقید کے موضوع کا ایسا پہلو ہے جو ایک سماجی تحریک کا رخ اختیار کر جاتا ہے۔ اس میں افراد، ادارے، اقوام، اور ممالک سبھی کی توجہ مرکوز ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ یہ نہ صرف فطرت بلکہ خود انسان کی بقا کا مسئلہ ہے۔

ماحولیاتی تنقید کے یہ موضوعات علم ماحولیات کا ثمر ہیں جو خود ایک سائنس ہے۔

رابرٹ ڈی بلارڈ (Robert D.Bullard) کا شمار ماحولیاتی انصاف کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> Environmental Justice embraces the principle that all the people and communities are entitled to equal protection of our environmental laws".[۳۱]

یعنی ماحولیاتی انصاف کا اصول یہ ہے کہ تمام افراد اور ادارے ماحولیاتی قوانین کی حفاظت کے لیے یکساں طور پر کام کریں۔ پہلی ماحولیاتی تحریک نے ۱۹۶۰ء میں امریکہ میں جنم لیا۔ رچل کیرسن کی کتاب Silent spring جو ۱۹۶۲ء

میں شائع ہوئی جس نے اس تحریک کو جلا بخشی۔ اس کتاب میں مصنف نے امریکی معاشرے میں ماحولیاتی مسائل اور ان کے اسباب پر بات کی ہے۔ مصنف نے کیڑے مار ادویات کے مضر اثرات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کی یہ بات سرمایہ کاروں کے مفاد پر ضرب تھی لہٰذا وہ رچل کیرسن اور اس کے نظریے کے مخالف ہو گئے۔ تاہم یہ کتاب ماحولیاتی آگاہی و شعور اور ماحولیاتی انصاف کے حوالے سے ایک منشور کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی دوران لائٹ وائٹ، لیو مارکس، کیرولین مرچنٹ اور کچھ دوسرے ماحولیاتی مفکرین رچل کرسن کے ہم آواز بن گئے جنھوں نے ادب اور ماحولیاتی بحران کے متعلق سوال اٹھایا۔ انھوں نے انسانی برتری کے دعوے کو مسترد کیا اور ماحول اور ماحولیات پر بات کی۔ بیداری کی اس لہر نے امریکی ادب میں فطرت نگاری کی قدیم روایات کو پھر سے زندہ کر دیا جس کا عکس فضائی آلودگی کے زہریلے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ ان کے علاوہ دیگر کئی مصنفین اور ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ماحولیاتی آگاہی اور شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان لکھاریوں نے ماحولیاتی مسائل سے زیادہ فطری دنیا اور ماحول سے انسانی تعلق کو اپنا موضوع بحث بنایا، اس سے قبل مصنف فطرت سے انسانی تعلق کی تعبیر انفرادی نقطہ نظر سے کیا جاتا تھا۔[۳۲]

ماحولیاتی تنقید کی دوسری لہر اور فعال تحریک ۱۹۹۰ء کی دہائی میں شروع ہوئی۔ اس تحریک کا موضوع طبعی ماحول میں انسان کی شرکت یعنی فطرت اور انسان کا باہمی رشتہ کیا ہے اس تحریک کا عنوان تھا۔ لارنس بیول، جوناتھن بیٹ اور ولیم ورڈزورتھ وغیرہ فطرت نگار اور فطرت کے دلدادہ تھے، انھوں نے ماحولیاتی تنقید کے تناظر کو وسیع کیا اور اس تحریک کو ایک دبستان کے طور پر نمایاں کیا۔ ماحولیات پسندوں نے اس سلسلے میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ شیرل گلاٹفیلٹی اور سلووک جیسے ادیبوں نے سالانہ ادبی کانفرنسوں کا انعقاد کیا جن کی کوششوں سے ماحولیاتی ادب کو ماحولیاتی ادب کی ترویج اور اس پر تحقیق کے لیے ۱۹۹۲ء میں ایک ماحولیاتی ادبی تنظیم ایسوسی ایشن فار سٹڈیز آف لٹریچر اینڈ انوائرنمنٹ(ASLM) کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۹۳ء میں پیٹرک ولی نے Interdisciplinary Literature and Environment (ISLE) instudies کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا۔ اس رسالے نے ماحولیاتی شعور اور فکر کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن اپنی شناخت قائم کرنے اور حیثیت منوانے میں اس موضوع کو کم و بیش تیس برس لگے۔ تب جا کر ادبی منظر نامے پہ ماحولیاتی تنقید کو نمائندگی حاصل ہوئی۔[۳۳]

اردو ادب میں ماحولیاتی تنقید کا آغاز بہت تاخیر سے ہوا، لمبے عرصے تک یہ انگریزی ادب کے زیر اثر رہا۔ انیسویں صدی کے اوائل نے امداد امام اثر نے کاشف الحقائق تحریر کی۔ اس کتاب میں انھوں نے ادب میں فطرت کی

اساس کی بات کی۔ برکھا برسی مگر بنجر زمینوں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ شعور و آگاہی کا فقدان، نو آبادیاتی نظام اور سیاسی کشمکش کے سبب اس کتاب کو پذیرائی نہ مل سکی۔ بیسویں صدی کے وسط میں محمد حسن عسکری نے انسان پسندی اور فطرت کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ اس زمانے میں لوگوں کی توجہ زیادہ تر پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی طرف مبذول تھی لیکن ماحولیاتی ادب کا موضوع کم از کم منظر عام پر آگیا۔ اس موضوع پر لکھے گئے مضامین اور مقالہ جات کی بات کی جائے تو پروفیسر رباب رضوی نے ۱۹۸۶ء میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان "انسان اور ماحول: ایک جغرافیائی تجزیہ" تھا۔ جس میں انھوں نے جغرافائی تناظر سے انسان کے ہاتھوں ماحول کی تسخیر کی وجہ سے فطرت اور ماحول میں ہونے والے نقصان کا تجزیہ کیا۔ نسترن احسن فتیحی کی کتاب ایکو فیمینزم ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ مصنفہ ناول نگار، محقق اور شاعرہ ہیں اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ یہ کتاب حقوق نسواں پر لکھی گئی ہے مگر اس کا ایک باب جانوروں کی آزادی اور قبائلی باشندوں کو جنگلات سے محروم کیے جانے کے موضوع پر مشتمل ہے اور انھوں نے ماحول کی تباہ کاریوں کے متعلق ادبی حلقوں کے متحرک ہونے کی تعریف کی۔[۳۴]

اردو ادب میں ماحولیاتی تنقید پر پہلی باقاعدہ کتاب اردو ادب کا ماحولیاتی تناظر ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی جس میں ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے انگریزی مقالات اور کتب کے اردو تراجم کو یکجا کیا گیا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی لکھتے ہیں کہ:

> "مجھے افسوس ہے کہ میں اس دنیا کے آلودہ ترین شہر میں بیٹھ کر یہ کتاب لکھ رہا ہوں جو بہت
>
> تکلیف دہ بات ہے یہ زمین ہم سب کا مشترکہ گھر ہے انسانوں کا بھی اور دوسری مخلوقات کا بھی"۔[۳۵]

انھوں نے غیر طبقاتی معاشرے اور سماج کی بات کی جس میں نباتات حیوانات انسان اور دوسرے مظاہر فطرت برابر کے باسی ہوں جہاں کسی دوسرے کا حق غصب نہ ہو۔

ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر نیر عباس کی خدمات گراں قدر ہیں "ماحولیاتی تنقید انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں" کے عنوان سے ان کا مقالہ اردو ادب میں ان لکھاریوں اور محققین کے لیے مشعل راہ ہے جو آئندہ ماحولیاتی تنقید کے موضوع پر کچھ لکھنے کی جستجو رکھتے ہوں گے۔ انھوں نے فطرت اور ماحول کے مضمرات پر بشر مرکزیت کے تناظر میں روشنی ڈالی اپنے موضوع کی وضاحت اور تقویت کے لیے انتظار حسین کے افسانوں "اجنبی پرندے"، "مور نامہ"، "چیلیں" اور "دھوپ" کو مثال بنایا انھوں نے نو آبادیات میں فطرت کے استحصال کا

تذکرہ بھی کیا۔ ان کے علاوہ اردو ادب میں ماحولیاتی تنقید پر کام کرنے والوں میں ڈاکٹر آرزو چفت سورین (پروفیسر استنبول یونیورسٹی ترکی) کا مقالہ "یشار کمار کے ناراض سمندر میں ماحولیات کے مسائل"، سید کاشف علی شاہ اور ڈاکٹر رخشندہ مراد کا مشترکہ مقالہ "ماحولیاتی انصاف" اور مجید امجد کی شاعری (ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ)، شیخ عقیل احمد کا مقالہ "قدیم ہندوستانی فلسفہ اور کالی داس کی تخلیقات میں ماحولیاتی اشارے" (پروفیسر یونیورسٹی آف دہلی) ڈاکٹر صوفیہ یوسف کا مقالہ "حجاب کا ناول پاگل خانہ اور ماحولیاتی تنقید" (ایسوسی ایٹ پروفیسر و چیرپرسن شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور)، محمد عرفان حیدر کا مقالہ "ادب اور موسمیاتی تبدیلیاں: عالمی اور مقامی تناظر"، اور نوشین قمر کا مقالہ "اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں نو آبادتی اثرات کا مطالعہ: ماحولیاتی ادبی تنقید کی روشنی میں" شامل ہیں

بیسویں صدی جدید ٹیکنالوجی کے بے تحاشا استعمال اور سرمایہ دارانہ نظام کے زیر اثر ماحول اور ماحولیات پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ اس طرح فطرت اور انسان کے قدیم بندھن ٹوٹ گئے اور انسان سخت کرب کا شکار ہو گیا۔ ہجر اور وصال کی اس کہانی نے انسانی شعور کو بیدار کیا اور اب وہ فطرت سے جدائی کے اسباب تلاش کرنے قابل ہو رہا ہے۔ اب وہ ماحولیاتی انصاف کی بات کرتا ہے۔ انسان کو کرہ ارض میں ہونے والی موسمیاتی تبدیلیوں کا ادراک ہو چکا ہے۔ اب انسان حیوانات، نباتات اور زمین کے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کر رہا ہے۔ ماحولیاتی بیداری کی یہ لہر پوری دنیا میں محسوس کی جا رہی ہے۔ زیرِ نظر تحقیق بھی اسی ماحولیاتی شعور میں اضافے کے لیے کی گئی ہے جو ذہن کے تالاب میں ایک پتھر پھینکنے کی مانند ہے جس سے اس ٹھہرے ہوئے پانی میں شاید کچھ ارتعاش پیدا ہو جائے۔

ماحولیاتی تنقید فطری دنیا اور ادب کے درمیان رشتوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ یہ ان مطالب اور مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے جن کا منبع و محور فطرت ہے۔ ماحولیاتی تنقید ادب اور فطرت پر انسان کی حاکمیت کو مسترد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادب اور فطرت کے سادہ تجزیات کی بجائے فطرت کی طاقت کو سامنے لانے کی کوشش کرتی ہے۔ غرض یہ کہ ماحولیاتی تنقید کے حامی ماحول پسندوں اور فطرت پسندوں نے فطرت کو انسان کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔[۳۶]

نو آبادیات اور فطرت کا استحصال:

یورپ میں خیالی تحریک اور نشاۃ ثانیہ سے پہلے انسان اور فطرت کا رشتہ بہت گہرا تھا جو مساوات اور باہمی احترام پر مبنی تھا۔ آہستہ آہستہ انسان خود غرض ہوتا چلا گیا اور اس طرح انسان پسندی نے فطرت اور انسان کے اس رشتے کو کمزور کر دیا۔ برطانیہ کے مشہور فلاسفر فرانسس بیکن (Francis Bacan) نے کہا تھا کہ:

"فطرت کے قوانین کا علم ہو جائے تو فطرت کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔"[۳۷]

یہ الفاظ اس دور کے مفکرین کے خیالات کے عکاس ہیں۔ یہی خیالات آگے چل کر جدید تہذیب کا نقطہ آغاز ثابت ہوئے۔ صنعتی انقلاب آیا، سائنسی ایجادات ہوئیں اور اس طرح یورپ کے جدید عہد کی پر شکوہ اور ہیبت ناک عمارت استوار ہوئی۔ یورپ سمندری مہمات طے کرتا افریقہ اور ایشیا تک پہنچا اور مختلف اقوام پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اٹھارویں صدی صنعتی انقلاب کی صدی تھی۔ پیداوار میں اضافے کی خواہش، خام مال کی طلب اور نئی تجارتی منڈیوں کی نمائش ایسے امور تھے جن کی وجہ سے یورپین کے لیے دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنا، ان کے وسائل تک رسائی حاصل کرنا اور نئی آبادیوں کا قیام ضروری تھا۔ انگریز سرمائے کی تلاش میں بھوکے بھیڑیوں کی طرح افریقہ اور ایشیا میں پھیل گئے اور مختلف علاقوں اور اقوام پر قابض ہو گئے اور برصغیر کے باشندوں کو بھی طوق پہنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح نو آبادیات کے ساتھ ہی تسخیر فطرت کی شروعات ہو گئی۔ نو آبادیات کا فطرت کے استحصال کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

برصغیر میں ۱۸۰۳ء تک انتظام حکومت پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کی حکومت علامتی تھی جو ۱۸۵۷ء میں اختتام پذیر ہو گئی۔ ابتدائی مرحلے میں انگریزوں نے لوٹ مار کی، وسائل پر غاصبانہ قبضہ کیا، تجارت میں اجارہ داری حاصل کی، صنعتی انقلاب کی وجہ سے سرمایہ دار گروہ وجود میں آئے اور مال کی کھپت اور خام مال کے حصول کے لیے قبضے کو طول دیا گیا۔ یورپ کے بعد امریکہ اور جاپان بھی صنعتی ترقی کے بعد اسی روش پر چل نکلے۔ زرعی اور خام معدنی مال غلام ملکوں سے حاصل کر کے تیار شدہ مال انھی ملکوں میں فروخت کرنا رواج پا گیا۔ اس کا اتنا مالیہ وصول کیا جاتا کہ بنگال جیسے زرخیز علاقے میں لوگ فاقہ زدہ ہو گئے۔ دوسرے مرحلے میں فوجی اور انتظامی لحاظ سے انگریزوں نے خود کو مستحکم کر ہی لیا تھا۔ انھوں نے برصغیر کے تہذیب و ثقافت، سماج اور جغرافیہ پر بھی مکمل اجارہ داری حاصل کرنے کی ٹھان لی تھی۔ تیسرے مرحلے کا تعلق ہندوستان میں ماحولیاتی نو آبادیات (Ecological Colonialty) سے ہے۔ اس دور میں جدید ٹیکنالوجی کا صحیح معنوں میں آغاز ہوا۔ وسیع پیمانے پر نہری نظام اور ریلوے ٹریک بچھانے کا منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس طرح جغرافیائی لینڈ سکیپ کو تبدیل کیا گیا اور اس سے مقامی ماحولیات پر شدید اثرات مرتب ہوئے۔ یہ منصوبے در اصل غلاموں کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد فوجی نقل و حمل، مخالف تحریکوں کے افراد تک رسائی، معدنی و زرعی مال پر قبضہ کرنا اور انھیں بندر گاہوں تک پہنچانا تھا۔ ریلوے کا نظام برطانوی سرمایہ داری نظام کی اہم ضرورت تھا اور اس بڑے منصوبے کا اژدھا ہندوستان میں پائے جانے والے

فطرت کے عظیم مظہر جنگلات کو نگل گیا۔ ریلوے کا نظام برطانوی سرمایہ داری نظام کی اہم ضرورت تھا۔ ہندوستان کے جنگلات کا رقبہ یورپ کے جنگلات کے رقبے کا نصف تھا۔ ڈاکٹر اورنگزیب کی کتاب ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر کا علاقہ فطرت کے حوالے سے کتنا زرخیز تھا جس کا برطانیہ نے خوب استحصال کیا۔[۳۸]

نوآبادیاتی نظام میں ریلوے لائن بچھانے کو نوآبادیاتی ترقی اور جدیدیت کے مفہوم کے طور پر لیا جاتا ہے جب کہ دوسرے معنوں میں یہ فطرت کا استحصال اور جبر ہے۔ ڈاکٹر اورنگزیب نے متذکرہ بالا دوہرے ماحولیاتی شعور (Environmental Double Conciousness) کے مطالب کو منیر نیازی کے اس شعر سے واضح کیا ہے:

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیرؔ

ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا[۳۹]

عام طور پر تو اس شعر کا ایک سادہ سا مفہوم ہے یعنی ریل کی سیٹی یا ریل کی روانگی دوری اور فراق کی ندا ہے جو دل کو لہو لہو کر دیتی ہے لیکن برصغیر کے نوآبادیاتی دورِ غلامی میں ریل کو تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ شعر دوہرے ماحولیاتی شعور کا عکاس ہے۔ نوآبادیاتی دور کے بیدار اور جدید ذہن ریلوے کے اس منصوبے کو دوہرے ماحولیاتی شعور کے طور پر خیال کرتے ہیں۔ اس شعر میں صبح کاذب کی ہوا سے مراد نوآبادیاتی جدت ہے جس کو صبح کے حوالے سے اور ریل کی سیٹی کو فطرت کے استحصال کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہ کیسی جدیدیت ہے کہ صبح برصغیر میں روشنی کی بجائے غم اور تاریکی لے کر آئی ہے اور برصغیر کے سماج، ثقافت، انسانوں اور فطرت سبھی کو غلامی کے طوق میں جکڑ لیا۔ یورپ میں جدیدیت کا مفہوم سماجی و تعلیمی اصلاح، عقلیت پسندی، انسانی حقوق، نئے سائنسی علوم اور آزادی ہے جب کہ ایشیا، افریقہ اور دیگر نوآبادیات میں جدیدیت کا مفہوم یکسر مختلف ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے مطابق:

"ریل ہندوستان میں ٹیکنالوجی اور جدیدیت کا اولین نقش تھا۔

ریلوے کا نظام برطانیہ کے سرمایہ دارانہ نظام کی ضرورت اور خواہش تھی"۔[۴۰]

ہندوستان کثیر جنگلات سے ڈھکا ہوا اور سرسبز کھیتوں سے لہلہاتا، وسیع رقبے پر مشتمل ایک زرعی ملک تھا۔ رقبہ وسیع ہونے کے سبب ہر علاقے کی مٹی کی خاصیت اور آب و ہوا مختلف تھی جس کی وجہ سے اس خطے میں درختوں کی کئی الگ

الگ اقسام پائی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی میں مدراس شہر میں تعینات سکاٹ لینڈ کے سرجن Edward Green Balfour نے ہندوستان اور مشرقی جنوبی ایشیا کے مقامی پودوں، درختوں، پرندوں اور دیگر حیوانات پر تین کتابیں لکھیں:

- The Cyclopedia of India, Eastern and Southern Asia 1857.
- Birds of India and South Asia 1858.
- The Timber trees; Timber and fancy wood 1862. [۴۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برصغیر ہزاروں پرندوں، جانوروں اور جنگلات کا گھر تھا۔ یہ اعداد و شمار فطرت کی خوبصورتی اور دلکشی کو آشکار کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس قدرتی سرمائے کی لوٹ مار کے لیے جمع کیے گئے تھے۔ 1872 میں W.J Blanfor نے اپنی کتاب The Flora of British India ترتیب دی جو سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں بلین فور نے نباتات کی چودہ ہزار دو سو پچاس اقسام کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں چار ہزار ایک سو دس پرندوں، ممالیا، مچھلیوں اور حشرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ انگریز ماہرین نے ہر ضلع کی الگ الگ اعداد و شمار کی فہرست مرتب کر رکھی تھی۔ اس کے مطابق ضلع راولپنڈی میں ایک سو تین پودوں کی اقسام کی فائل، پشاور میں ایک سو بارہ نباتات اور ستر سے زائد جانوروں اور پرندوں کی اقسام کا ذکر کیا گیا ہے۔

اردو کے افسانوی ادب میں بھی برصغیر کے جنگلات کی کثرت اور شادابی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے سید رفیق حسین کے افسانے اہم ہیں۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء اور ۴۰ء کی دہائی میں افسانے لکھے۔ برصغیر کے قدرتی حُسن اور جنگلات کے حوالے سے ان کا افسانہ کفارہ اہم ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> "شام کے وقت چوکاندی کے ڈھائے کے کنارے کسی فائر لائن پر کھڑے ہوں تو دونوں طرف کے اونچے سال کے جنگلوں میں لاکھوں قد آور درختوں کے تنے ہی تنے اوپر کے سبز پتوں سے بنی ہوئی چھت کے اندھیرے میں نگاہ سے اوجھل پڑتے پڑتے غائب ہو جاتے ہیں۔ ڈھائے کی طرف صدہا جھاڑیاں ان پر بیلیں اور دھانی رنگ کے نازک پودوں کے بعد ہری کچی بیت کی بیلوں سے بنی ہوئی جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی نگاہ نرکل کے لہلہاتے تختے پر میلوں جا کر دھندلی پڑتے پڑتے کسی دور دراز جنگل میں مل جاتی ہے جو کہ فاصلے کی وجہ سے دھندلا غبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ [۴۲]

جنگلات مقامی باشندوں اور جنگلی حیات کا مسکن بھی تھے اور ذریعہ معاش بھی۔ لکڑی، ایندھن، عمارتی تعمیر اور رہٹ یا پھر کشتی سازی کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ درختوں کی کٹائی کم اور افزائش زیادہ تھی، اس طرح یہ سلسلہ ماحولیاتی انصاف پر قائم تھا۔ اس کے برعکس انگریزوں نے ان درختوں کو تجارتی مقاصد کے لیے بڑے پیمانے پر کاٹا اور فطرت کا منصفانہ نظام تباہ کر دیا۔

۱۸۴۹ء سے ۱۹۰۰ء تک برصغیر میں تیس ہزار چھے سو ستائیس کلو میٹر طویل ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ریلوے ٹریک پر ڈالنے کے لیے سلیپر دو لاکھ ساگوان کے قیمتی درخت کاٹ کر بنائے گئے۔ ایندھن کے لیے چیڑ جیسی لکڑی کا بے دریغ استعمال کیا گیا اور اسی طرح انجن کے ایندھن کے لیے کوئلہ کیکر، شیشم اور ساگوان کے درختوں کو جلا کر حاصل کیا گیا۔ انگریزوں کی حریص نظریں ان کی آمد کے ساتھ انھیں جنگلات پر جم گئیں۔ انھیں علم تھا کہ معاشی لحاظ سے یہ درخت اور ان کی لکڑی بہت قیمتی سرمایہ ہیں لہٰذا انھوں نے تجارتی اور معاشی حوالے سے جنگلات کی بے دریغ کٹائی کی۔ انتظامی معاملات میں اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ناگ پور اور خاندیش کے وسیع رقبے پر پھیلے جنگلات کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ ان جنگلات کچھ جرائم پیشہ قبائل آباد تھے اُن کی سرکوبی کے نام پر جنگلات کو برباد کیا گیا۔ "اندھے کو کیا چاہیے دو انکھیں"۔ ڈاکٹر اورنگزیب کی کتاب اردو ادب ماحولیاتی تناظر میں کے مطابق ۱۸۶۳ء میں مغربی خاندیش میں تعینات ایک سٹیلمنٹ افسر کے یہ الفاظ ماحولیاتی صورت حال کی خوب عکاسی کرتے ہیں کہ:

> "اس مغربی ضلع کی آب و ہوا نباتات کے لیے بہت موزوں ہے یہ امر کسی دیکھنے والے کے لیے عجیب ہے کہ پورے ضلع میں درختوں کی شدید قلت ہے۔ مشرقی نندوبار گاؤں کے ارد گرد چند ناقابل ذکر درختوں کے علاوہ میلوں تک کسی درخت یا جھاڑی کا نام و نشان نہیں ملتا۔"[۴۳]

پوالی داس کی کتاب Colonialism, Development and the Environment میں جنگلات کی کٹائی کے تمام اعداد و شمار تحریر کیے گئے ہیں کہ کس طرح انگریزوں نے بے رحمی کے ساتھ لاکھوں درختوں کو کاٹا۔ بلاشبہ لوٹ کا مال تھا اور لٹیرے ایسا ہی کرتے ہیں۔ نتیجتاً ۱۹۴۷ء میں تک برصغیر میں درختوں کی قلت پیدا ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے انسانوں کے ساتھ ساتھ فطرت کو بھی اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اس طرح سماج، جغرافیہ، ثقافت اور فطرت کا استحصال کیا۔ ریلوے، زراعت، جنگلات اور دیگر ذرائع سے حاصل کردہ یورپ منتقل کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو جنگلات کی شدید قلت تھی۔[۴۴]

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، ماحولیاتی تنقید کو ۱۹۹۰ء کی دہائی میں امریکہ میں فروغ ملا۔ خصوصاً جب ۱۹۹۲ء میں ماحول اور ادب کے مطالعے کے لیے ایسوسی ایشن فار دی اسٹڈی آف لٹریچر ایڈ انوائرنمنٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس

ایسوسی ایشن کی بنیاد دانش وروں اور مصنفین کے ایک گروپ نے رکھی تھی۔ یہ اب بھی ماحول کو لاحق خطرات سے متعلق کام کر رہی ہے۔ اس ادارے کے اراکین ماحولیاتی تحقیق، تعلیم، ادب، فن، ماحولیاتی انصاف، اور ماحولیاتی استحکام کے لیے پر عزم ہیں۔ اس کے اراکین میں ایسے مصنفین اور اساتذہ شامل ہیں جو مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر ماحولیات، تحفظ حیاتیات، ماحولیاتی تاریخ، ماحولیاتی فلسفہ اور ماحولیاتی قوانین وغیرہ۔ اس ادارے کا نصب العین ایک مکمل معاشرہ ہے۔ ۱۹۹۲ء میں جاپان نے اس آرگنائزیشن کو متعارف کروایا۔ اس ادارے کو دنیا بھر میں بہت سراہا گیا اور اب تیس سے زیادہ ممالک اور چودہ سو پچاس ممبران اس ادارے کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس کو فعال بنانے کے لیے پر عزم ہیں۔ [۴۵]

۱۹۹۳ء کے بعد یہ ادارہ سال میں دو دفعہ تقاریب منعقد کرتا ہے جن میں دنیا بھر سے ادارے سے منسلک ممبران اور ماحولیات کے تحفظ میں دل چسپی لینے والے افراد شرکت کرتے ہیں۔ اس ادارے کا ایک سہ ماہی جریدہ Interdisciplinary studies in Literature and Environment (ISLE) بھی ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے ذریعے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ہر شمارے ماحولیاتی مسائل، فطرت کی خوبصورتی، فطرت کو لاحق خطرات اور ماحول کے تحفظ کے لیے انسانی ذمے داریوں پر مختلف مضامین، افسانے، نظمیں اور تحقیقی مقالات وغیرہ شائع کیے جاتے ہیں۔ [۴۶]

ماحولیاتی تنقید اپنے مسائل، ترجیحات اور دلائل کے حوالے سے اپنی معاصر تنقیدی دبستانوں سے مختلف ہے۔ نو مارکسیت، تانیثیت، ساختیات، پس ساختیات اور مابعد نو آبادیات وغیرہ کے محرکات تاریخی، ثقافتی، لسانی اور فلسفیانہ ہیں جب کہ ماحولیاتی تنقید کا محرک فطرت کو لاحق خطرات ہیں۔ ماحولیاتی تنقید کا مقصد ماحول کی بقا ہے جس سے انسانی زندگی براہ راست وابستہ ہے۔ مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، رومانوی تنقید، تاریخی اور سوانحی تنقید اور دیگر تنقیدی دبستانوں میں یہ بات مشترک ہے کہ انسان کی زندگی، قوت متخیلہ، انسان کے ذہنی محرکات اور معاشرتی مسائل کے گرد گھومتی ہے جب کہ ماحولیاتی تنقید اس کے برعکس نئے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ مثال کے طور پر:

- فطرت کیا ہے؟
- فطرت کو لاحق خطرات ادب میں کس طرح بیان کیے گئے ہیں؟
- فطرت کے تحفظ کے ضمن میں انسانی ذمے داریوں کا کیا کردار ہے؟
- ادب میں فطرت کے شعور کو کس طرح اجاگر کیا جا سکتا ہے؟ [۴۷]

تنقیدی دبستان کوئی بھی ہو، اس کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مخصوص علمیات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ ادب کا مطالعہ باریک بینی سے کرتا ہے اور اس کا جواز بھی اپنے اندر رکھتا ہے لہٰذا ہر تنقیدی دبستان کی شروعات سوالات پر ہوتی ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو ادب کے مطالعے کو منفرد بناتے ہیں۔ ادب کا مخصوص اور اہدافی مطالعہ ہی کسی تنقیدی دبستان کی پہچان ہوتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید صرف یہ نہیں دیکھتی کہ کس ادبی پارے میں درخت، پہاڑ، چرند پرند، ندی نالے، دریا، سمندر، بادل، بارش اور پودوں وغیرہ کی نمائندگی کس انداز میں کی گئی ہے بلکہ وہ ادب میں ہونے والے اس تجربے کا تجزیہ اور مفہوم بیان کرتی ہے جو سماجی، ذہنی اور طبعی منطقوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس تنقیدی دبستان کے تین رخ ہیں:

- پہلا رخ یہ ہے کہ ادب کے اصول وہی ہیں جو ماحولیات کے ہیں۔
- دوسرا رخ یہ ہے کہ طبعی دنیا اور انسانی ثقافت میں مطابقت ہے۔
- تیسرا رخ یہ ہے کہ انسان نے قدرت کی بنائی ہوئی طبعی دنیا کو تسخیر کرنے کے جنون میں اسے تباہی کے دہانے پر پہنچادیا ہے اور خود اپنی زندگی کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔[۴۸]

ماحولیاتی تنقید کا تصور یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے دوسری شے سے جڑی ہوئی ہے۔ ماحولیاتی نقاد ولیم رئیکرٹ نے اس کا اطلاق ادب پر کیا اور ادب کی ماحولیاتی شعریات تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جس طرح ماحول میں کوئی چیز دوسری چیز سے جدا نہیں اسی طرح ادب کے ماحول میں کوئی متن، ادب خلق کرنے والے اور سمجھنے والے کردار، ادب کی تخلیق انجام دینے والے ذرائع اور ادب کی تخلیق میں حصہ لینے والے عوامل سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں چناں چہ ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں ہیئتی تنقید کا یہ دعویٰ ہے کہ ادب ایک خود مختار اکائی ہے۔

بیسویں صدی میں دو عالم گیر جنگیں ہوئیں۔ ان دونوں عالمی جنگوں نے نہ صرف دنیا بھر کے ممالک کے معاشی، اقتصادی، سیاسی اور عسکری ہیئت کو تبدیل کیا بلکہ ان جنگوں نے لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا اور عالمی ماحول کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ اس سب کے باوجود ۱۹۶۲ء میں نیوٹران بم اور ایٹم بم کی دوسری قسم ہائیڈروجن بم تیار کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف ماحولیاتی حدت میں اضافہ ہوا بلکہ جنگلات کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ اس پس منظر میں ماحولیاتی تنقید نے آنکھ کھولی۔ اس تنقید کا میدان بہت وسیع ہے۔[۴۹]

ماحولیاتی تنقید رومانی شاعری، سائنسی بیانیہ، عمارت کاری، جانوروں کی کہانیوں، فطرت کی عکاسی کرتی تحریروں، غرض ہر طرح کے متن کو زیر بحث لاتی ہے۔ سائمن ایسٹک (Simon Estok) کے مطابق ماحولیاتی تنقید کا کام ادب میں فطرت کی عکاسی سے کہیں زیادہ ہے۔ ماحولیاتی تنقید کے بارے میں ان کا موقف ہے کہ:

"It is a theory that is committed to effecting change by analyzing the function: thematic, theoretical, ideological, social, artistic and historical or otherwise of natural environment or aspects of it, represented in documents (literary or other) that contribute to material practices in material world". [۵۰]

ماحولیاتی نقاد، تہذیبی ارتقا، انسانی تصور اور اس کرہ ارض پر موجود ہر چیز کے درمیان تعلق کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی تحقیق کرنے کی بھی سعی کرتا ہے کہ انسان ماحولیاتی توازن کی اہمیت کا شعور رکھتا ہے؟ اگر انسان کو ماحولیاتی توازن کا ادراک ہے تو وہ اس کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ تہذیب و ثقافت اور ادب میں ماحولیاتی مسائل کی عکاسی کس طرح کی جارہی ہے۔ ابتدا سے ہی انسان معاشرت اور فطرت کے عوامل جیسے تہذیب و ثقافت اور ادب میں قریبی تعلق رہا ہے۔ جیسے جیسے انسان نے ترقی کی منازل طے کی ہیں تو انسان کی تہذیب و ثقافت، طرز معاشرت اور ادبی نقطہ نظر بھی بدل گیا ہے۔ ترقی کی راہیں ہموار کرتے کرتے انسان یہ بھول گیا ہے کہ وہ خود زمین کو مسلسل تباہ کر رہا ہے جو سائنسی ترقی کے نام پر فطرت کے استحصال کا سبب بن رہا ہے۔ حالاں کہ زمین پر زندگی کی ضمانت ماحولیاتی توازن ہے۔

ماحولیاتی نقاد صرف ادب اور کلچر پر توجہ مرکوز نہیں رکھتا بلکہ وہ توازن برقرار رکھنے کے لیے تمام شعبہ ہائے علوم پر بھی نظر رکھتا ہے کیوں کہ یہ علوم (تاریخ، سیاسیات، نفسیات، اخلاقیات، فلسفہ اور معاشیات وغیرہ) کلچر اور ادب کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ انسان نے اپنی برتری کے غرور میں فطرت کے استحصال پر اپنے لیے پر سکون معاشرے کی خواہش کی جس کا نتیجہ ایک ایسے ماحولیاتی بحران کی صورت میں سامنے آیا جو نہ صرف خود انسان کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا ہے بلکہ کرہ ارض کی بقا کے لیے بھی آزار کا باعث ہو رہا ہے۔ زمین پر ماحولیاتی تباہی کا تمام سامان مثلاً عالمی درجہ حرارت میں اضافہ، شدید بارشیں یا شدید خشک سالی، سموگ، جنگلات کی کٹائی، شرح آبادی میں اضافہ، اوزون کی تباہی، ایٹمی تابکاری، صنعتوں کے خام مال سے بننے والی کاربن گیسز، پلاسٹک بیگز کا وسیع پیمانے پر استعمال، جنگ و جدل، مختلف جانداروں کی معدومیت وغیرہ در حقیقت انسانی لالچ اور فطرت کے بارے میں مغرورانہ رویہ ہے۔

ایلڈو لیوپولڈ (Aldo Leopold) کی کتاب (A Sand County Almanac) ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ماحولیات پسندی کی تاریخ کا اہم واقعہ ثابت ہوئی۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ ایلڈو لیوپولڈ نے زمینی اخلاقیات (Land Ethics) کا ذکر کیا۔ زمینی اخلاقیات فطرت کے استحصال کی بجائے فطرت کے احترام اور حفاظت پر زور

دیتی ہے۔ ایلڈ ولیو کے مطابق حیاتیاتی معاشرے میں انسان اور دوسری انواع برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔ کسی بھی نوع کو دوسری نوع کے استحصال کا حق حاصل نہیں ہے۔ ایلڈو کے ان خیالات کو فلسفۂ ماحولیات کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔[۵۱]

ناروے کے فلسفی آرن نائس (Arne Naess) نے 1972ء میں پہلی مرتبہ فلسفۂ ماحولیات کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کے مطابق ماحولیاتی بحران سے بچنے کے لیے ماحول کے تحفظ پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ ارن نائس نے اپنے ساتھی امریکی فلسفی جارج سیشنز (George Sessions) کے ساتھ مل کر فلسفۂ ماحولیات کو ایک سماجی تحریک بنانے کے لیے آٹھ اصول مرتب کیے:

- زمین پر نوع انسان اور دوسری انواع برابر کی حصہ دار ہیں۔ انسان اپنے مقاصد کے لیے دوسری انواع کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔
- انسان کو زمینی اخلاقیات کا خیال رکھنا چاہیے۔
- انسان کو اس کرہ ارض پر اپنی آسائش کی تکمیل کے لیے فطرت کے استحصال کی اجازت نہیں۔
- انسانی حرص کے باعث اس کی بے جا مداخلت پریشان کن ہے اور ماحولیاتی بحران کا سبب بن رہی ہے۔
- ماحولیاتی بحران کی ایک بڑی وجہ شرح آبادی میں اضافہ بھی ہے۔ معاشرتی، معاشی اور سماجی بہتری کا انحصار آبادی کی کمی پر ہے۔
- نظریاتی تبدیلی کا مقصد زندگی کے معیار کو اونچا لے جانا نہیں بلکہ اس کو بہتر بنانا ہے۔
- ماحولیات کے تحفظ اور بچاؤ کے لیے خاص حکمتِ عملی اختیار کرنا ہوگی۔
- جو لوگ ان نکات پر دستخط کر چکے ہیں ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کو نافذ کرنے کی کوشش میں حصہ لیں۔[۵۲]

یہ اصول معاشرتی ماحولیاتی انصاف اور اپنے فلسفیانہ اصول کے حوالے سے فلسفۂ ماحولیات کو ماحول پسندی سے بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ماحولیات پسندی کی تحریک ماحولیات کے بچاؤ اور ماحولیاتی سائنس پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ فلسفۂ ماحولیات کے داعیان اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ ماحولیاتی تحفظ اور ماحولیاتی مسائل پر توجہ کرنے کے ساتھ بشر مرکزیت (Anthropocentrism) کی اصلاح کرنا بھی ضروری ہے کہ انسان کس طرح فطرت کا استحصال کرتا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر بشر مرکزیت کو حیات مرکزیت (Biocentrism) میں تبدیل کر لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انسان کو فطرت کے ساتھ تعلق پر غور کرنا ہوگا اور اپنی زندگی کو بدلنا ہوگا۔

فلسفۂ ماحولیات کے مفکر ساز گیری سنائڈر (Garry Snyder) کہتے ہیں کہ:

"اگر انسان کو زمین پر زندگی گزارنی ہے تو اسے اپنی پرانی تہذیبی روایت کو ایک ایسی نئی ثقافت میں تبدیل کرنا ہو گا جو ماحول کے حوالے سے روحانی، سائنسی، حساس اور ہم آہنگ ہو۔ اس تغیراتی حصول کے لیے ہمیں اپنے ذہن کے ساتھ ساتھ معاشرتی عقائد کو بھی بدلنا ہو گا اور اقتصادیات کو ماحولیات کی ایک اہم شاخ کے طور پر دیکھنا ہو گا"۔[۵۳]

نئی تہذیب کا تقاضا صنعتی سماج کے خلاف ناانصافی کی راہ ہموار کرنا ہے جو انسانی ترقی کے نام پر زمین کے وسائل کو اپنے سرمائے میں اضافے کا ذریعہ اور خام مال تصور کرتی ہے۔

بیری کامنر (Barry Commoner) بیسویں صدی کے ماہر ماحولیات تھے۔ انھوں نے ماحولیاتی بحران کے اسباب کا تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ماحولیات کے چار قوانین مرتب کیے۔ یہ قوانین فطری اقدار اور صنعت و حرفت کے درمیان توازن قائم کرتے ہیں۔

Four laws of Ecology:

- Everything is connected to everything else.
- Everything must go somewhere.
- Nature knows the best.
- There is no such thing as a free lunch.[۵۴]

ماحولیات کا پہلا قانون:

Everything is connected to everything else.

فطرت کی ہر چیز ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ دنیا کا ماحولیاتی نظام (دریا، سمندر، فضا، جنگل، ہوا، پانی، مٹی) ایک ایسا جال ہے جس میں ہر چیز کسی نہ کسی طرح ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی ہے اور مربوط ہے۔

درخت آکسیجن فراہم کرتے ہیں جو جانداروں کے لیے ضروری ہے۔ جنگلات کی کٹائی سے نہ صرف جنگلی حیات پر اثر پڑتا ہے بلکہ یہ انسانوں کے لیے بھی نقصان کا باعث ہے۔ اس سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار بڑھ جاتی ہے جو ماحولیاتی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ جنگلات کی کٹائی سے درجہ حرارت بڑھتا اور بارشوں میں کمی آتی ہے جو قدرتی آفات کا سبب بنتی ہے۔ بارش کی کمی کے باعث مٹی کی زرخیزی کا متاثر ہونا، پانی کی قلت، فصلوں کی پیداوار میں کمی اور مویشیوں کے لیے گھاس کی قلت جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

زمین کا زیادہ تر حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ اگر آبی ذخائر جیسے سمندر، دریا، جھیلیں، تالاب اور نہریں وغیرہ آلودہ ہو جائیں تو اس کے اثرات آبی حیات پر مرتب ہو جاتے ہیں۔ صنعتی فضلہ جو آبی آلودگی کی بڑی وجہ ہے، دریاؤں سے ہوتا

ہوا سمندروں میں جا پہنچتا ہے جو آبی حیات کو متاثر کرتا ہے۔ جب ان آبی جانداروں کو انسان اپنی خوراک میں شامل کرتا ہے تو یہ خطرناک کیمیائی مادے انسان میں منتقل ہو جاتے ہیں اور اس کی صحت کو متاثر کرتے ہیں۔ اس طرح انسان متعدد بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے جن میں کینسر اور جگر کے امراض شامل ہیں۔

اس قانون کے تحت فطرت کی ہر چیز زیک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہ قانون ہمیں ذمے دارانہ رویہ اختیار کرنے کی ترغیب دلاتا ہے اور یہ باور کرواتا ہے کہ فطری نظام میں بے جا مداخلت نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔

ماحولیات کا دوسرا قانون:

Everything must go somewhere.

دنیا میں کسی چیز کا مکمل خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی اور جگہ اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔ جب درختوں سے پتے گرتے ہیں تو وہ گل سڑ کر مٹی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور نئے پودوں کے لیے غذائیت فراہم کرتے ہیں۔ سمندر سے فضا کے راستے کالی گھٹائیں برستی ہیں اور دریاؤں سے ہوتا ہوا وہی پانی پھر سے سمندر کا حصہ بن جاتا ہے۔ یعنی جب سورج کی حدت زمین اور سمندر پر پڑتی ہے تو پانی بخارات بن کر آسمان کی طرف اٹھتا ہے اور بادلوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر دوبارہ بارش کے ذریعے زمین پر برستا ہے۔ سمندروں، دریاؤں، جھیلوں میں پھینکا جانے والا پلاسٹک باریک ذرّات کی صورت میں ہماری خوراک، پینے کے پانی اور ہوا میں شامل ہو جاتا ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ اسی طرح گاڑیوں اور فیکٹریوں سے نکلنے والا زہریلا دھواں ہوا میں شامل ہو کر فضائی آلودگی کا سبب بنتا ہے۔

ماحولیات کا تیسرا قانون:

Nature knows the best.

اس قانون کے مطابق فطرت خود کو بہترین طریقے سے منظم کرتی ہے اور جب انسان اس میں مداخلت کرتا ہے تو اس سے غیر متوقع مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ جب انسان فطرتی ماحول میں مصنوعی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے تو اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً فوڈ پروسسنگ، کیمیائی کھاد اور جراثیم کش اسپرے کے جدید طریقوں سے اجناس متاثر ہو رہی ہیں۔ مصنوعی کھادیں فصلوں کی پیداوار کو بڑھا تو سکتی ہیں لیکن یہ مٹی کی زرخیزی کو ختم کر دیتی ہیں۔ جنگلات کی کٹائی اور سرسبز وادیوں کو کنکریٹ کی عمارتوں اور سڑکوں میں بدلنے جیسے عوامل موسمیاتی تبدیلی کا باعث بن رہے ہیں۔ چار عشرے قبل لوگ کپڑے کے تھیلے اور چھال سے بنی ٹوکریاں خرید و فروخت کے لیے استعمال کیا کرتے تھے یہاں تک کہ دودھ اور دہی کے لیے بھی لوگ اپنے برتن لے کر جاتے تھے۔ اس کے برعکس آج کے دور میں ہر چیز کی خرید و فروخت کے لیے پلاسٹک کے بیگ استعمال کیے جاتے ہیں۔ پلاسٹک میں زہریلے کیمیائی مادے پائے

جاتے ہیں جو انسانوں اور فطری ماحول کے لیے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ پلاسٹک کو جلانے سے اس کے باریک ذرات ہوا میں شامل ہو جاتے ہیں جو پھیپھڑوں کی بیماری کا سبب بنتے ہیں۔

ماحولیات کا چوتھا قانون:

There is no such thing as a free lunch.

اس قانون کے مطابق کائنات میں کوئی چیز بلا معاوضہ نہیں ملتی۔ فطرت کے استحصال کی ہمیشہ ایک ماحولیاتی قیمت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جنگلات کی کٹائی جنگلی حیات کی تباہی، حیاتیاتی تنوع، سمندروں کی تیزابیت اور سیلاب کا باعث بن رہی ہے۔ اسی طرح سائنسی اختراعات، نیوکلیائی تجربات اور صنعتی ترقی نے فضاؤں کو آلودہ کر دیا۔ آب و ہوا میں قدرتی تغیرات ہوتے رہتے ہیں لیکن انسانی سرگرمیوں کی بدولت زمین کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔

شرل گلاٹ فلٹی (Shirley Glatt Feltey) امریکا کی ایک معروف ماحولیاتی نقاد ہیں۔ انھوں نے ماحولیاتی تنقید کو فروغ دینے میں مرکزی کردار ادا کیا اور اس کو ایک باقاعدہ شعبے کے طور پر متعارف کروایا۔ شرل گلاٹ کا اہم کارنامہ The Ecocriticism Reader: Landmarks in literary ہے جسے انھوں نے ہیرالڈ فرام (Horold fromm) کے ساتھ مل کر 1996ء میں مرتب کیا تھا۔ ان کا یہ مجموعہ ماحولیاتی تنقید کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں ماحولیاتی تنقید کے ارتقا، فکری اور نظریاتی پس منظر اور موجودہ رجحانات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں ماحولیاتی تنقید کی تعریف نہایت سادہ اور جامع انداز میں پیش کی گئی ہے:

> "Ecocriticism is the study of the relationship between literature and the physical environment". [۵۵]

یعنی ماحولیاتی تنقید ادب اور ماحول کے مابین تعلق کا مطالعہ ہے۔ گلاٹ فیلٹی کے مطابق ادب کو صرف انسانی دنیا کا ترجمان نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو یہ بھی مد نظر رکھنا چاہیے کہ ادیب کس طرح فطری دنیا کے ساتھ اپنا تعلق استوار کرتا ہے اور کس انداز میں ماحولیاتی شعور کی بیداری کو اجاگر کرتا ہے۔ انھوں نے ماحولیاتی تنقید کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

"ماحولیاتی تنقید ماحولیاتی شعور کی بیداری کا نام ہے۔ ادب ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو فطرت اور انسان کے مابین تعلق کو مؤثر انداز سے پیش کرتا ہے۔ اس تعریف کی رو سے ماحولیاتی تنقید کا مقصد فطرت سے متعلق شعور اور آگاہی فراہم کرنا، فطرت کو لاحق خطرات کے بارے میں جاننا، فطرت کو تحفظ فراہم کرنا اور انسان کو اس کی ذمے داریوں سے روشناس کروانا ہے"۔ [۵۶]

ماحولیاتی بحران پر قابو پانے کے لیے یومِ ارض (Earth Day) اورماحولیات کا عالمی دن (World Environment Day) منایا جاتا ہے۔ دونوں دنوں کا مقصد فطرت سے محبت، فطرت کو لاحق خطرات اور ہماری ذمے داریاں کیا ہیں ؟ کو فروغ دینا ہے۔ یومِ ارض ہر سال ۲۲ اپریل کو اور ماحولیات کا عالمی دن ۵ جون کا منایا جاتا ہے۔ ماحولیات کا عالمی دن ۱۹۷۲ء میں سوئیڈن میں ہونے والی اقوامِ متحدہ کی ماحولیاتی کانفرنس کے بعد ۱۹۷۳ء سے بنایا جاتا ہے۔ یومِ ارض کی شروعات ۱۹۷۰ء میں امریکا سے ہوئی جو پوری دنیا میں پھیل گیا۔

دونوں دنوں کے مقاصد:

- ماحولیاتی بحران پر قابو پانا
- ماحول اور حیاتیاتی تنوع کی حفاظت کی اہمیت کو اجاگر کرنا
- فضائی و آبی آلودگی، گلوبل وارمنگ اور پلاسٹک کا خاتمہ جیسے درپیش مسائل سے چھٹکارہ حاصل کرنا
- عوام میں فطرت سے متعلق شعور بیدار کرنا
- بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی تعلیم بھی دینا تاکہ وہ زمینی اخلاقیات کا خیال رکھ سکیں۔
- جنگلات کی حفاظت کرنا اور شجرکاری کی مہم کو فروغ دینا
- پلاسٹک کی آلودگی کا خاتمہ اور ماحولیاتی بحالی ان دنوں کے مقاصد ہیں۔[۵۷]

ادب اطفال: بنیادی مباحث

ادب اطفال سے مراد ایسا ادب ہے جو بچوں کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عام فہم زبان میں تحریر کیا جاتا ہے۔ ادب اطفال کا آغاز اٹھارہویں صدی میں مغرب میں ہوا تھا۔ ادبِ اطفال کا مقصد صرف بچوں کو تفریح فراہم کرنے تک محدود نہیں تھا بلکہ ادیبوں نے تفریح کے ساتھ ساتھ معلوماتی موضوعات اور جدید علوم و فنون کو بھی ادب کا حصہ بنایا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں بچوں کی تربیت کے لیے اخلاقی اور مذہبی کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا گیا۔

جان نیوبری (John Newberry) کو بچوں کے جدید ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے ۱۷۴۴ء میں لندن میں بچوں کی کتب شائع کرنے کے لیے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کا شمار بچوں کی کتب شائع کرنے والے اولین اداروں ہوتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے بچوں کی نظموں کا مجموعہ Mother Goose's Melody شائع کیا۔ ان کی خدمات کے پیش نظر نیوبری میڈل بنائی گئی جو ۱۹۹۲ء سے ہر سال امریکی لائبریری ایسوسی ایشن کی طرف سے ادب اطفال کے ادیبوں کو حُسنِ کارکردگی کے طور پر دی جاتی ہے۔ جان نیوبری کی مشہور کتب میں Little Goody Two-Shoes اور A Little Pretty Pocket-book شامل ہیں۔ ان کی کتب میں زیر بحث موضوعات تعلیمی نوعیت کے ہوتے تھے جن میں بچوں کو بڑوں کا ادب، وقت کی پابندی، صفائی کا خیال رکھنا، عاجزی و انکساری، نیکی اور شر کی تمیز، دیانت داری اور سچائی جیسی عادات سکھائی جاتی تھیں۔ اس دور میں بچوں اور بچیوں کے لیے الگ الگ کہانیاں لکھی جاتی تھیں۔ بچیوں کے لیے گھریلو ذمے داریاں مثلاً کھانا پکانا، سلائی کڑھائی اور چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا جیسے کرداروں کو تحریر کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نرم لہجہ اور اخلاقی نصیحتوں کے ذریعے وفاداری، صبر اور حیا جیسی خوبیوں اور اقدار کو اپنانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس طرح لڑکوں کو خود مختار، فیصلہ ساز، تاجر، باہمت اور معاشرے کے کفیل کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ یہ صنفی کردار اس دور کے معاشرے کے عکاس تھے جب کہ آج کے دور میں لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر اہمیت دی جاتی ہے۔

مِس تھامس بورمین (Thomas Boreman) نے اٹھارہویں صدی میں Description of Three Hundred Animals کے عنوان سے ایک کتاب لکھی اس کتاب میں بچوں کی دل چسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف جانوروں سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں جانوروں کی تین سو مختلف اقسام کے بارے میں معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ ان کی رہائش، کھانے پینے کی عادات، جسمانی ساخت اور دلچسپ معلومات کو بھی تحریر کیا گیا

ہے اس میں جانوروں کے تصویری خاکے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مغربی ادب اطفال میں بچوں کی ذہنی عمر(Chrono Logocal Age) کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔

اردو ادب میں بھی ابتدائی دور سے ہی ادب اطفال سے متعلق کہانیاں اور نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ آزادی کے بعد جن ادیبوں اور شعرا نے ادب اطفال کو فروغ دیا ان میں محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، پریم چند، اکبر الہ آبادی، اسماعیل میر ٹھی، صوفی تبسم، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر سیفی پریمی، محمد اسحاق، پروفیسر ذاکر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، شوکت پردیسی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور تلوک چند محروم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسماعیل میر ٹھی اور محمد حسین آزاد نے نصابی کتابوں کے ذریعے بچوں کے ادب کی آبیاری کی اور الطاف حسین حالی نے اصلاحی تحریروں کے ذریعے بچوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت پر زور دیا۔ علامہ اقبال نے بھی بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔ ان کی نظموں میں عہد طفلی، شیر خوار، ہمدردی، ایک گائے اور بکری، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک مکڑا اور مکھی وغیرہ شامل ہیں۔ تلوک چند نے ادب اطفال سے متعلق انگریزی کی مشہور نظموں کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ ان کی اہم نظموں میں سچائی، وقت کی پابندی، جھوٹ اور بولنا عیب ہے شامل ہیں۔ شوکت پردیسی کا شمار ادب اطفال کے بہترین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "تحفۃ الاطفال" ہے جس میں بچوں کی فکری سطح کو بلند کرنے کے لیے نظمیں تحریر کی گئی ہیں۔

موجودہ دور میں جب ہم ادب اطفال پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اعلیٰ اخلاق اور تفریح و تفنن کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں دیو، پری، جن اور بھوت وغیرہ جیسے مافوق الفطرت عناصر کو موضوع بنا کر اخلاقی سبق دیا جاتا ہے۔ اخلاقی خوبیاں صحت مند معاشرے کے لیے بہت اہم ہیں۔ عصر حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری زندگی کی بنیادی ضرورت بن چکی ہے۔ اعلیٰ اخلاق کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ بچوں کو جدید موضوعات جیسے الیکٹرانک میڈیا، ماحولیاتی تعلیم اور مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) سے روشناس کروایا جائے تاکہ بچوں کے ذہن جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکیں اور بچوں کی ذہنی عمر کے مطابق ادب تخلیق کیا جائے۔

اردو دنیا میں اکادمی ادبیات اطفال پاکستان، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، پاکستان چلڈرن میگزین کونسل، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کلب پاکستان، چلڈرن بک ٹرسٹ بھارت، نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو اور نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ایسے فعال ادارے ہیں جو عصری تقاضوں اور بچوں کی ذہنی صلاحیت اور دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادب اطفال کو فروغ دینے میں سرگرم عمل ہیں۔[۵۷]

رسائل وجرائد کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اردو سائنس میگزین لاہور، ادبیات اطفال، پھول، بچوں کی دنیا، ٹوٹ بٹوٹ، نو نہال، کھلونا، غنچہ اور بچوں کا گوشہ شہرت یافتہ رسائل ہیں جو ادب اطفال کے عصری تقاضوں پر پورا اترتے ہیں۔ بچوں کے لی ادب تخلیق کرنا ایک مشکل مشغلہ ہے کیوں کہ اس کے لیے بچوں کی نفسیات اور دلچسپیوں کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے نیز زبان اور الفاظ کے استعمال میں بھی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ ادب اطفال تخلیق کرتے وقت درج ذیل قواعد وضوابط کو مد نظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ ادب اطفال تخلیق کرنے کے لیے بچوں کی ذہنی عمر کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

۲۔ بچوں کی دلچسپی اور نفسیات کو بنیاد بنا کر ادب تحریر کیا جائے۔

۳۔ بچوں کی دلچسپی کے لیے موضوعات کو دل کش تصاویر کے ساتھ واضح کرنے کی سعی کی جائے۔

۴۔ بچوں کی کہانیاں مختصر اور جامع ہونی چاہئیں تاکہ بچوں کی رغبت برقرار رہے۔

۵۔ ادب اطفال کو ڈرامائی انداز میں ٹیلی وژن یا ریڈیو کے ذریعے پیش کیا جائے۔

۶۔ تفریح و تفنن کے ساتھ ساتھ حب الوطنی، انسان دوستی، ماحولیاتی شعور اور سائنس اور ٹیکنالوجی جیسے مضامین کو موضوع بنایا جائے۔

ماحولیاتی تبدیلی دور حاضر کے سب سے بڑے مسائل میں سے ایک ہے۔ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آئندہ فطرت اور انسان کی بقا کو مستقبل میں شدید خطرات لاحق ہوں گئے۔ لہذا بچوں میں فطرت سے متعلق شعور بیدار کرنا بے حد ضروری ہے فطرت اور ماحولیاتی تبدیلیوں، فطرت کو لاحق خطرات اور اس سلسلے میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں بچوں کی کہانیوں کا لازمی موضوع ہونا چاہیے اور ان موضوعات کا اسکول کی سطح پر بچوں کے سلیبس کا حصہ ہونا چاہیے۔

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے جس میں لوگ افراتفری کا شکار ہیں ان کے پاس فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہی نہیں۔ اب وہ دور نہیں رہا جب بچے سرسبز اور شاداب کھیتوں میں سیر کرتے، گندم، مکئی اور چاولوں کے موسم میں لطف اندوز ہوتے، دریاؤں اور نہروں میں تیراکی کرتے، سرسبز درختوں اور پودوں سے تازہ پھل اور سبزیاں کاٹتے، جانوروں کی پرورش کرتے، تروتازہ ہوا میں سانس لیتے، قدرتی ماحول میں پرورش پاتے، مگر آج کل کے بچے ان حقیقی خوشیوں سے محروم ہیں ان کو ویڈیو گیمز، کارٹون چینلز، موبائل فون، الیکٹرانک میڈیا جیسی مصنوعی خوشیاں مہیا کی جارہی ہیں۔[۵۸]

انسان اپنے فائدے کے لیے فطرت کا استحصال کررہا ہے اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ماحول میں الودگی بڑھ رہی ہے، عالمی حدت میں اضافہ ہورہا ہے، سمندروں کی سطح بلند ہورہی ہے، گلیشئرز پگھل رہے ہیں، جانور ناپید ہوتے جارہے

ہیں اور نئی نئی بیماریاں جنم لے رہی ہیں اور قدرتی آفات اب معمول بن چکی ہیں۔ اس حوالے سے ماہر موسمیات باورچ رینکویچ(Baruch Runkiewicz)لکھتے ہیں کہ:

> "ہمارے بعد طوفان عظیم ہو گا،لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ محض ایک کہانی ہے۔جو ہم کہہ رہے ہیں اس کاوہ تصور بھی نہیں کرسکتے۔انھیں فہم نہیں کہ ہر چیز میں تبدیلی کاامکان ہے۔زمین کے وہ سانس لیتے ہیں۔روزمرہ کا معمول،موسم،سمندر،دریا،جنگل،گرمی،سردی،بہار،خزاں اور بلند معیارِ زندگی۔آنے والی نسلیں یاتوماحول میں ڈھل جائیں گی یاوہ معدوم ہو کر رہ جائیں گی۔۔۔۔ مگر مجھے کیاہے۔۔۔میں مطمئن ہوں کیوں کہ میں اُس وقت موجود نہیں ہوں گا"۔[۵۹]

ان مسائل کے پیش نظر ماحولیاتی تنقید کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ موجودہ ماحولیاتی بحران خود انسان کی وجہ سے ہے۔ اس نے اپنے مفاد کے لیے فطرت کا استحصال کیا ہے۔ماحولیاتی تنقید انسان میں فطرت کے متعلق شعور و آگاہی،اس کا تحفظ اور اس کے حوالے سے انسان کی ذمے داریوں کے متعلق شعور پیدا کرتی ہے۔ اس طرز فکر کو بچوں کے ادب میں شامل کرنا چاہیے کیوں کہ فطرتی بیداری ایک صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہے۔

ادب اطفال ذہنی و جسمانی تعلیم و تربیت، تخیلاتی طرز، سبق آموز اور عام فہم زبان میں تحریر کیا جانا چاہیے۔تصویری کتب بچوں میں دل چسپی اور ماحولیاتی آگاہی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بچے عام نصابی کتب سے زیادہ تصویری کتب سے محظوظ ہوتے ہیں اور ان کتب سے بچوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔اگر ادب اطفال کے ذریعے بچے فطرت کو درپیش خطرات اور فطرت کے تحفظ کے لیے انسانی ذمے داریوں کو سمجھ لیں تو آنے والے مستقبل میں ماحولیاتی مسائل سے نمٹا جاسکے گا کیوں کی بچے ہی کسی قوم کا روشن مستقبل ہوتے ہیں۔

ادب اطفال کے حوالے سے ایک اہم نام انڈیا کے اَمِت جارج(Amit Garg)کا ہے۔انھوں نے ادب اطفال کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے بچوں کے لیے بے شمار کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں میں بچوں کو فطرت سے محبت اور فطرت کے تحفظ کا درس دیا جاتا ہے۔ ان کی کہانی The Greatest Treasure ہے جس میں فطرتی عناصر کو انسانوں کے لیے قیمتی خزانہ قرار دیا گیا ہے۔ اور فطرت کے مختلف عناصر جیسے سمندر، دریا، چرند پرند، جانور، پہاڑ، صحرا، اور جنگل کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے تا کہ انے والی نسل میں ماحولیاتی شعور کو اجاگر کیا جا سکے یہ کہانی پیٹر نامی ایک بہادر لڑکے کی ہے جو خزانے کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اکیلے سفر کرتے کرتے وہ ایک گھنے اور پراسرار جنگل میں پہنچتا ہے جہاں وہ خوف محسوس کرتا ہے۔ مگر خوش قسمتی سے اس کی ملاقات ایک شیر سے ہوتی ہے۔ وہ دونوں دوست بن جاتے ہیں اور ایک ساتھ سفر کرتے ہیں۔ یہاں شیر انسانی دلیری کی علامت ہے جو ہر طرح کے حالات میں ثابت قدم رہتا ہے اور ہمت نہیں ہارتا۔ پھر وہ

دونوں ایک پہاڑ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں اُن کی ملاقات ایک عقاب سے ہوتی ہے۔ تینوں دوست بن جاتے ہیں ۔عقاب کی نظر اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ دور سے ہی اپنے شکار کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ تینوں مل کر خزانے کی تلاش کے لیے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور وادی سے گزرتے ہوئے ایک بھیڑ سے دوستی کر لیتے ہیں۔ بھیڑ کی اون سردیوں کی مختلف چیزوں میں استعمال ہوتی ہے جو سردی سے بچاتی ہے۔ پھر وہ تینوں ایک صحرا میں پہنچتے ہیں جہاں ان کی دوستی ایک اونٹ سے ہوتی ہے۔ اونٹ جو ریگستانی جہاز کہلاتا ہے اونٹ بھی اُن چہاروں کے ساتھ مل کر سفر پر روانہ ہوا۔ پیٹر، بھیڑ اور شیر کو اونٹ نے اپنے اوپر بیٹھالیا جب کہ عقاب آسمان سے یہ منظر دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ پھر یہ سب سمندر کے کنارے پہنچ گئے اور وہاں ان کی دوستی ایک کچھوے سے ہوئی۔ کچھوے کی مدد سے انھوں نے سمندر پار کیا اور اور آخر کار ایک الو سے ملے۔ جب الو کو انھوں نے بتایا کہ وہ ایک خزانے کی تلاش میں آئے ہیں تو الو نے ان کو مبارک باد دی کہ وہ اصل خزانے تک پہنچ گئے ہیں سب حیران ہوئے اور الو کی طرف دیکھا۔ الو نے انھیں جواب دیا:

> "تم سب نے ایک دوسرے کی مدد تحت پراسرار جنگل عبور کیا، پہاڑ چڑھے، وادی سے گزرے، صحرا کی گرمی کو برداشت کیا اور سمندر کو پار کر لیا۔ یہ تمام کٹھن منزلیں تم ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر کبھی نہ طے کر سکتے۔ اصل خزانہ ہیرے جواہرات نہیں بلکہ دوستی، محبت، تعاون اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہے۔"[۶۰]

اس کہانی میں شیر دلیری کی علامت، عقاب دور اندیشی کی، بھیڑ گرم جوشی اور سکون کی، اونٹ صبر و استقامت کی جب کہ الو دانائی کی علامت ہے۔

- اس کہانی کے توسط سے یہ آگاہی فراہم کی گئی ہے کہ فطرت ہی سب سے قیمتی خزانہ ہے۔ دریا، سمندر، چرند پرند، جانور، پہاڑ، ریگستان اور دیگر فطرتی عناصر انسان کی اصل خزانے ہیں۔ ان کا تحفظ ہی ہماری بقا ہے۔
- اتحاد طاقت ہے پیٹر نے شیر، عقاب، اونٹ، بھیڑ اور کچھوے کے ساتھ مل کر تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے انسان کو دوسری مخلوقات پر کوئی برتری حاصل نہیں۔
- جانور اور پرندوں کی مدد کے بغیر پیٹر یہ سفر کبھی نہ مکمل کر پاتا تو اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو فطرت سے محبت اور باہمی احترام کا تعلق قائم رکھنا چاہیے۔
- الو سب سے مخاطب ہوتا ہے کہ تم سب ایک دوسرے کی مدد کی وجہ سے اصل خزانے تک پہنچے اصل خزانہ ہیرے جواہرات نہیں بلکہ دوستی، باہمی احترام اور فطرت سے محبت ہے۔

- یہ کہانی بچوں میں ماحولیاتی شعور کو بیدار کرتی ہے۔

امت گارگ (Amit Garg) لکھتے ہیں کہ:

"اگر شروع سے ہی بچوں میں فطرت سے محبت اور فطرت کے تحفظ کا جذبہ پیدا کیا جائے تو بچے آنے والے دور میں موسمیاتی تبدیلیوں پر قابو پانے کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے۔"[۶۱]

یہ کہانی بیری کامنر کے پہلے ماحولیاتی اصول پر پورا اترتی ہے کہ

Everything is connected to everything else.

یعنی فطرت کی ہر چیز ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہے۔ دنیا کا ماحولیاتی نظام (دریا، سمندر، فضا، جنگل، ہوا، پانی، مٹی، ریگستان، چرند پرند، جانور) ایک ایسا جال ہے جس میں ہر چیز کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ادب اطفال کے حوالے ۲۰۱۸ء Ecocritical perspective on Children's Texts and Cultures کے عنوان سے ناروے سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کے مصنفین میں Lykke Uluru, Oddrun Hallas, Bjorg, Nina Goga اور Sabine Helma شامل ہیں۔

یہ کتاب ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے بچوں کے ادب، ذرائع ابلاغ اور ثقافت کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کتاب میں ادب اطفال، فطرت، ماحول، ماحولیاتی تبدیلی، پائیدار اور صحت مند طرز زندگی جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ کتاب ادبیات، تعلیم و تربیت اور ماحولیات کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ بچوں کا نصاب مرتب کرنے کے لیے ایک رہنما کتاب ہے جو اساتذہ، اسکالرز اور تعلیمی پالیسی سازوں کے لیے اہم ہے۔ اس کے ذریعے ادب اطفال میں ماحولیاتی شعور اور فہم کو فروغ دیا گیا ہے اور ایسا ادب تخلیق کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بچوں کی تخلیقی و فکری تعلیم و تربیت کو فطرت اور ماحول سے جوڑنے میں معاون ہو۔

اس کتاب کے اہم موضوعات میں ادبِ اطفال اور ماحولیاتی تنقید یعنی فطرت اور ماحول کی عکاسی اور ان کے ذریعے بچوں میں ماحولیاتی فہم کو کیسے اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے نصاب میں ماحولیاتی نظم و نثر کی شمولیت سے ان میں پائیدار طرز فکر پیدا کرنا، ماحولیاتی حوالے سے ذرائع ابلاغ کا کردار اور بچوں پر اس کا اثر وغیرہ۔

دراصل نئی نسل کو آگاہ کرنا ضروری ہے کہ جو عمل وہ سرانجام دیتے ہیں اس سے اردگرد کا ماحول وجود میں آتا ہے۔ انسان کے اردگرد وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات کا تعلق انسانی سرگرمیوں سے ہے۔ بچوں کو یہ باور کروانا بھی ضروری ہے کہ انسان کے رویوں کی وجہ سے ہی اس کے اردگرد مثبت یا منفی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اپنے اردگرد کے بیمار ماحول کو ٹھیک کرنے اور اس کو دوبارہ خوبصورت بنانے کے لیے بچوں کی سرگرمیاں کیا ہونی چاہئیں یہ

سب بچوں کے علم میں لانا ضروری ہے۔ تمدن، آب و ہوا اور بچوں کی فطرت کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس طرح نئی نسل کی توجہ ماحول اور ماحولیات کی طرف مبذول کرانے میں نظمیں اور کہانیاں کار آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

ماحولیاتی تنقید ایک تھیوری ہے جسے چند اسکالرز نے مل کر بعد از تحقیق پیش کیا ہے۔ ان میں Lawrance Buell, Clotfelty اور William Ruekert شامل ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق ادب اور ماحول کے درمیان گہرا رشتہ ہے یعنی ایسا ادبی مطالعہ جس میں انسان اور فطرت کے باہمی تعلقات کو موضوع بنایا جائے۔ اگر کسی نظم یا نثر ماحولیاتی آلودگی، جنگلات کی بربادی، قدرتی مناظر کی تباہی کا ذکر ہو تو ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس تھوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دیکھا جاتا ہے کہ کوئی ناول، افسانہ، کہانی، نظم، ڈرامہ یا کوئی دوسرا ادبی متن پرندوں، جانواروں، درختوں، زمین، فطرت، ماحولیاتی آلودگی یا موسمیاتی تبدیلیوں کے بارے میں کیا نظریہ پیش کرتا ہے۔[۶۲]

اس نظریے کے مطابق تمدن اور انسان نہ صرف ایک بندھن میں جڑے ہیں بلکہ تمدن انسانی رویوں کا عکاس بھی ہے۔

انسان کی بہت سارے منفی اعمال ایسے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے ارد گرد کا ماحول بیمار اور آلودہ ہو گیا ہے یعنی ماحولیاتی آلودگی کا سبب خود انسان ہیں۔ مثلاً گاڑیوں اور کارخانوں کا دھواں، زہریلے پانی کا اخراج اور جنگلات کی کٹائی یہ وہ عوامل ہیں جو ماحولیاتی تبدیلیوں کا باعث بنے ہیں جن کی وجہ سے فطرت کو سنگین خطرات لاحق ہیں یعنی ہمارے سیارے میں درجہ حرارت کا بڑھنا انسانی رویے کا نتیجہ ہے۔

ہمیں چاہیے بچوں میں فطرت اور فطرت کو لاحق خطرات کے متعلق شعور اجاگر کرنے کے لیے ادبِ اطفال کی تحریروں میں اخلاقیات، خوبصورت مقامات، دلکش سبزہ زاد، دلکش فطرتی مناظر، پرندوں، جانوروں، پھولوں، تتلیوں، جگنوؤں اور انسان کو موضوع بنائیں نیز انسان کے علاوہ دیگر مظاہر قدرت کو بھی اہمیت دیں۔

بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لیے کہانیوں میں فطرت سے محبت اور ہمدردی کی بات کی جائے کہانی کا کردار ایسا ہو جس سے بچے متاثر ہوں اور اُس جیسا بننے کی کوشش کریں۔ کہانیوں میں فطرت کی خوبصورتی کو بیان کیا جائے اور اس کے حُسن کو باقی رکھنے کے لیے انسانی کوششوں کا ذکر کیا جائے اس سے نی صرف بچوں کو فطرتی ماحول کو سمجھنے میں مدد ملے گئی بلکہ وہ فطرت کی حفاظت کرنے کی ضرورت کو بھی محسوس کریں گے۔

ادب اطفال کے حوالے سے ایک نظریہ 'نظریۂ مابعد انسانیت'(Posthumanism) ہے۔ یہ ایک اجتماعی تحریک ہے۔ لہذا اس تحریک کا بانی کوئی ایک شخص نہیں بہت سے مفکرین تھے اس تحریک میں این کیتھرین ہیلس، روزی بریڈوٹی، کیری وولف اور ڈوناہاراوے شامل تھے۔

اس تھیوری میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان ہی اس دنیا کا اکیلا مالک نہیں ہے۔ انسان فطرت کا صرف ایک عنصر ہے جو فطرت کے دیگر عناصر جیسے پھل پھول، جانور، پرندے، پودے، دریا، سمندر کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ نظریہ بشر مرکزیت کو چیلنج کرتا ہے۔ یعنی انسان بھی فطرت کا صرف ایک حصہ ہے اور فطرت کے سبھی کردار آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔

بچوں کو یہ باور کروانے کی ضرورت ہے کہ زمین کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ زمین پر سب کا حق ہے نباتات کا بھی اور حیوانات کا بھی زمین کسی ایک مخلوق کی ملکیت نہیں ہے بچے جو کچھ اپنے ارد گرد یعنی گھر اور سکول سے سیکھتے ہیں بالکل اسی طرح بچے ماحول اور فطرت سے سیکھتے ہیں۔ ادبِ اطفال میں بچوں کو یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ نباتات پرندوں اور دیگر حیوانات ہوا اور پانی کے ساتھ اپنے رشتے اور تعلق کو سمجھیں اور ان کی حفاظت کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں۔ ادب اطفال میں بچوں کو یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ نباتات، پرندوں اور حیوانات کے ساتھ اپنے تعلق کو سمجھیں اور ان کی حفاظت کے سلسلے میں اپنی ذمے داریوں کو محسوس کریں۔

متذکرہ بالا کتاب میں کچھ کہانیوں اور نظموں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے تا کہ بچوں میں ماحول اور انسان کے باہمی رشتے کے متعلق فہم اور شعور پیدا کیا جا سکے۔ اس کتاب میں بیریت وارویک (Berit Warvik) نے شاعر ٹیڈ ہیوز (Ted Hughes) کے شعری مجموعے Marine Animal Imagery کی چار نظموں کا جائزہ لیا ہے۔ ٹیڈ ہیوز نے اپنی شاعری میں سمندر میں رہنے والی مخلوق اور فطرتی تنقید کو موضوع بنایا ہے۔ نظموں میں مختلف آبی حیات، اُن کی جبلت اور آپس کے تعلقات کا جا بہ جا ذکر ملتا ہے۔ ان نظموں کا مقصد سمندری حیات سے محبت اور ہمدردی پیدا کرنا، آبی حیات کے ماحول کو بہتر بنانا اور ان کی زندگی کا تحفظ ہے۔ یہ نظمیں نہ صرف بچوں کے لیے تفریح کا ذریعہ ہیں بلکہ ان کو فطرت کے قریب لانے میں بھی معاون ہیں۔ ٹیڈ ہیوز کی نظمیں سمندری جانوروں کے ماحول کو شفاف رکھنے اور ان کے تحفظ پر زور دیتی ہیں۔ اس کتاب میں مختلف شعرا کی نظمیں شامل ہیں جن میں ماریہ ریمونڈ کی نظموں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ اس کی نظمیں چیونٹی اور انسان کی باہمی مشابہت کے متعلق ہیں۔ چیونٹی کی بعض عادات انسانوں سے ملتی ہیں، جیسے انسان کا نظم وضبط وغیرہ۔ ان نظموں میں واضح الفاظ میں چیونٹی کی نقل و حرکت بیان کی گئی ہے اور اسے فطرت کے ایک جزو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے چیونٹیاں بھی ایسے ہی متاثر ہوئی ہیں جیسے انسان۔[۶۳]

اس کتاب میں "Who will save us from Rabbits" کے عنوان سے ایک کہانی بھی شامل کی گئی ہے۔ اس کہانی میں چیونٹیاں انسان کے ظلم کا شکار ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کی کسی طرح انسان کے مظالم سے بچا جائے۔ آخر کار طویل غور و فکر کے بعد چیونٹیاں انسان کو انتقاماً خرگوش بنا دینے کا منصوبہ بناتی ہیں ۔ خرگوش کو وہ نرم و ملائم اور اپنے

لیے بے ضرر تصور کرتی ہیں۔ وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سر توڑ کوشش کرتی ہیں۔ لیکن بزرگ چیونٹیاں اُن کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور نصیحت کرتی ہیں کہ فطرت سے چھیڑ چھاڑ اچھی بات نہیں ہے۔ اس کہانی کا ایک اخلاقی اور دوسرا ماحولیاتی پہلو بھی ہے۔ انسان کے علاوہ چیونٹیاں اور دیگر مخلوق بھی فطرت کا حصہ ہے اس کہانی سے فطرت کے ساتھ ہمدردی کا درس ملتا ہے زمین پر رہنے کا حق سب کا ہے۔ انسان کو اُن پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے اس کہانی کا اخلاقی سبق یہ بھی ہے کہ بدلہ لینا اچھا عمل نہیں ہے۔

نو سے بارہ سال کے بچوں کے لیے لکھی گئی Katrina Kohler کی تحریر بھی اس حوالے سے ایک عمدہ تحریر ہے جس میں ایسے بچوں کا ذکر کیا گیا ہے جو جانوروں کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ ایسے بچوں کو اس نے Wild Child کا نام دیا ہے۔ مصنفہ کے مطابق ایسے بچوں کے احساسات و جذبات اور محبت کرنے کا فطری جذبہ جانوروں سے ملتا جلتا ہے۔

کتاب "Ecocritical Perspective on Children 's Texts and Cultures" میں ادب اطفال اور فطرت کے درمیان موجود تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں :Poetic Constructions of Nature The Forest in Recent Visual poetry for Children کے عنوان سے ایک باب لکھا گیا گیا ہے جس میں بچوں کے لیے جنگل کے متعلق بصری شاعری لکھی گئی ہے۔ اس کے ذریعے بچوں میں جنگلات کے متعلق شعور و آگاہی اور تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کی گئی ہے۔ شاعری کے ذریعے بچوں کو فطرت اور جنگلات کے متعلق معلومات دی جاسکتی ہیں۔ اس سے بچوں کو جنگلات کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ بچوں کے لیے کی جانے والی شاعری اگر خوبصورت تصاویر کے ساتھ ہو تو زیادہ موثر ہوتی ہے۔ بصری تحریریں مظاہر قدرت کے متعلق شعور دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بچوں کے لیے ایسی تحریریں ہونی چاہئیں جو پر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی آلودگی، اس سلسلے میں انسان کا کردار اور فطرت کو لاحق خطرات وغیرہ جیسے موضوعات کا احاطہ کر سکیں۔

بچوں کا ادب اور ماحولیاتی تنقید

ادب اور فطرت کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ فطرت سے جڑے رہنے کی فوائد اور ثمرات کے بارے میں صدیوں سے لکھا جارہا ہے۔ کہانیاں چاہے قدیم ہوں یا جدید ہر دور میں فطرت کا موضوع ادبِ اطفال کا اہم حصہ رہا ہے۔ جس میں فطرت کے حُسن، فطرت سے محبت، فطرت سے جڑے رہنے کے ثمرات اور فطرت بطورِ استاد جیسے عنوانات پر توجہ دی گئی۔ ۔ فطرت کے متعلق شاعری اور کہانیاں بچوں کی تعلیمی سرگرمیوں کو بھی پر کشش بناتی ہیں۔ فطرت ہر دور میں ادب اطفال کا اہم حصہ رہی ہے مگر آج کے دور میں بچوں کو موسمیاتی تبدیلیوں، ان کی وجوہات اور ماحول کے

تحفظ کے لیے کیے جانے والے اقدامات کا علم و شعور دینا بہت ضروری ہے۔ آج کے ادب میں پرندوں اور جانوروں کو قیدی بنانے کی مذمت کی جارہی ہے، چڑیا گھر کی بجائے سفاری پارکس کی طرف توجہ مبذول کروائی جارہی ہے، پھولوں، پودوں اور درختوں کی تاراجی کا ذمہ دار بھی انسان کو قرار دیا جائے گا اور فطرت سے محبت کے ساتھ ساتھ فطرت کے تحفظ اور ماحولیاتی انصاف کی بھی بات کی جارہی ہے۔

جس طرح انسان پھلتا پھُولتا اور بڑا ہوتا ہے اسے ہی نباتات اور پرندے اور جاندار نشور نما پاتے ہیں اور انسانوں کی طرح نقل و حرکت کرتے ہیں بچے بھی اپنے اندر ایسی تبدیلیاں محسوس کرتے ہیں اور فطرت کے قریب ہوتے ہیں۔ زمین پر ہمیشہ سے ایک ماحولیاتی توازن قائم رہا ہے اس سیارے میں پانی، ہوا، درخت اور دیگر جاندار سب مل کر ایک توازن میں جیتے ہیں انسان کو بھی یہ سبق سیکھنے کی ضرورت ہے اچھی زندگی گزارنے کے لیے فطرت کے سبھی عناصر کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔

نینا گوگا (Nana Goga) ناروے کی ماہر ادب ہیں۔ وہ ویسٹرن ناروے یونی ورسٹی میں ادب اطفال پر قابل قدر خدمات سر انجام دے رہی ہیں۔ وہ بچوں کے ادب کی استاد ہیں اور بچوں کے لیے جدید تدریسی طریقوں، بچوں کے حقوق اور ماحولیاتی موضوعات پر کام کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں Literature as an exercise in Ecological thinking نینا گوگا کی ایک شاندار کوشش ہے۔ نینا گوگا کے مطابق بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیاں اور نظمیں صرف سنانے کی حد تک نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک فکری مشق ہے جو بچوں میں ماحولیاتی فہم اور شعور پیدا کرتی ہیں۔ بچوں کی کہانیاں فطرت کے ایسے مظاہر اور مسائل پر مشتمل ہونی چاہئیں جن کے ذریعے بچے فطرت اور ماحول ساتھ ہم آہنگ اور پر امن تعلق قائم کرنا سیکھ سکیں۔ ماحولیاتی فکری مشق (Ecological Thinking) سے مراد ایک ایسی آگاہی اور تربیت ہے جس سے انسان سیکھے کہ وہ محض فطرت کا ایک حصہ ہے اور فطرت پر اس کی کوئی حکمرانی نہیں ہے بلکہ فطرت کا احترام اور تحفظ انسان کی ذمے داری ہے۔ جب بچے کسی کہانی میں ایسے کردار کو دیکھتے ہیں جو فطرت سے محبت کرتا ہے، پانی کو ضائع اور گدلا ہونے سے بچاتا ہے اور پرندوں اور جانوروں کو قیدی کی بجائے آزاد دیکھنا چاہتا ہے تو بچہ فطرتی طور پر ان رویوں کو پسند کرتا ہے، سیکھتا ہے اور اپناتا ہے۔

نینا گوگا نے فدا نیلسن کے تحریر کردہ سویڈش ناول The Ice Sea Pirates کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ ایک دس سالہ بچی سیری کی کہانی ہے جو اپنی چھوٹی بہن کو تلاش کرنے کے لیے ایک خطرناک برفانی جزیرے کی طرف سفر کرتی ہے۔ یہ سفر انتہائی دشوار گزار ہے جو سیری کے لیے جذباتی اور فکری بھی ہے۔ اس سفر کے دوران وہ فطرت کے مختلف پہلوؤں برفانی ہواؤں، سرد موسم اور حدِ نظر گہرے سمندر کا مشاہدہ کرتی ہے وہ فطرت کے مختلف مظاہر اور انسان کے باہمی تعلق کی نوعیت کو سمجھتی ہے۔ سیری محسوس کرتی ہے کہ انسان فطرت کے رحم و کرم پر ہے سیری کا کردار

ایک فطرت پسند، ماحول دوست اور بہادر حساس لڑکی کا ہے۔ وہ جانوروں اور پرندوں کو ایذا نہیں پہنچاتی اور فطرت کے مظاہر کو مصیبت میں دیکھتی ہے تو احتجاج کرتی ہے۔ نینا گوگا ایسی کہانیوں کے ذریعے بچوں میں فطرت سے ہمدردری اور فطرت کی حفاظت کے لیے قربانی جیسے جذبے اور شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کہانی میں ولن کے طور پر ایک ایسا کردار دکھایا گیا ہے جو بچوں کا اغوا کار ہے اور اپنے مفاد کے لیے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کرتا ہے اور فطرت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ سیری اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور اس کی یہ کوشش ماحولیاتی انصاف کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کہانی میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ فطرت صرف ایک خوبصورت نظارہ ہی نہیں بلکہ زمین پر اس کا فعال کردار ہے۔ اس ناول میں اخلاقی سبق یہ ہے کہ فطرت سے محبت اور تعاون کرنا چاہیے۔

نینا گوگا کے خیال میں ایسے موضوعات پر مبنی کہانیاں بچوں کے تخیل کو بلند کرتی ہیں۔ ان میں اخلاقی اور ماحولیاتی انصاف اور ذمے داری کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ بچے سیری جیسے کرداروں سے متاثر ہو کر فطرت اور ماحول دوست سوچ کو اپنانے لگتے ہیں۔ یہ کہانی فطرت کے ساتھ جینا سکھاتی ہے اور بچوں کے لیے تفریح کے علاوہ فکری اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ کہانی فطرت کو لاحق خطرات کے خلاف مزاحمت کا استعارہ بھی ہے۔

بچوں کو ادب کے ذریعے فطرت سے محبت اور اس کے تحفظ کے متعلق شعور و آگاہی دینا ایک ایسی گراں قدر سرمایہ کاری ہے جو آئندہ نسلوں کو تباہی سے بچا سکتی ہے۔

۱۲ جون ۲۰۲۳ء میں کولمبیا ایمزون کے جنگل میں ایک طیارہ گر گیا۔ اس میں سب بڑے مسافر ہلاک ہو گئے اور ایک سال سے تیرہ سال کی عمر کے قریب ایک درجن بچے تیرہ سالہ بنزلی کی نگرانی میں چھے ہفتوں تک زندہ رہے جو کہ تاریخ میں انسانی بقا کی ایک مثال ہے۔ یہ بچے ماحولیاتی تعلیم و تربیت سے آراستہ تھے بنزلی کو معلوم تھا کہ کون سے پتوں سے آلودہ پانی صاف ہو جاتا ہے جنگل میں کون سے پھل اور بیج انسان کا کھا سکتا ہے، خیمہ کیسے بنایا جاتا ہے، مچھروں، سانپوں دیگر جنگلی جانوروں اور بارش سے بچوں کا تحفظ کیسے کیا جا سکتا ہے یہ واقعہ بچوں کی تعلم و تربیت کی افادیت کے حوالے سے قابلِ توجہ ہے۔[۶۴]

طریقہ تحقیق (فریم ورک):

مجوزہ تحقیق کا طریقہ کار کیفیتی (Qualitative) ہو گا۔ آنے والے ابواب میں جو طریقہ کار استعمال کیا جائے گا اس میں ماحولیاتی عناصر کی تقسیم کے لیے اے۔ کے سکائیگیب جرگ (A.K.Skyggebjerg) کے مضمون Poetic construction of Nature: The Forest in Recent visual poetry for children کے نظریات اخذ کیے ہیں دوسرے مضمون میں بی۔ او ہیلس ((B. O. Hallas) اور ایم۔ پی ہیجن (M. P Heggen) کے مضمون We are all Nature, Young Childrens statement about Nature کے نظریات کو مد نظر رکھا گیا ہے مزید بر آں ماحولیاتی تحفظ کے پہلو کے لیے لارنس بیول (Lawrence Buell) کے مضمون Environment Imagination کے نظریات کو مد نظر رکھا جائے گا جس کے مطابق مجوزہ تحقیق کا نظری فریم ورک یہ ہے:

۱۔ فطرت کی شاعرانہ تشکیل، جنگل میں حالیہ منظر

۲۔ ماحولیاتی شہریت کو ممکنہ طور پر پڑھنا اور فروغ دینا

۳۔ بچوں کا ادب: ماحولیاتی سوچ میں ایک مشق کے طور پر

۴۔ بچوں کی بصری شاعری

۵۔ انسان اور فطرت کے درمیان رشتہ

۶۔ ماحولیاتی مسائل ادب کے تجزیے میں بطور مددگار

۷۔ فطرت کو سمجھنے کے لیے فطرت کی نمائندگی کرنے والی نظموں کا مطالعہ

۸۔ فطرت کے بارے میں بچوں کی سوچ

۹۔ اظہاریوں میں فطرت کے نظارے

۱۰۔ حیوانوں کو دیکھنے کے مختلف طریقے

۱۱۔ انسانی تاریخ کا قدرتی تاریخ میں مضمر ہونا

۱۲۔ انسان کا صرف اپنے مفاد کو جائز سمجھنا

۱۳۔ماحول کی نمائندگی کرنا

۱۴۔فطرت کا چہرہ، دماغ کی آنکھ، موسموں کا ادراک

۱۵۔فطرت کے مطابق معاشرے کی اصلاح

۱۶۔قدرتی ماحول کو یاد رکھنے کی صلاحیت

۱۷۔ماحولیات کی جمالیات

۱۸۔ماحولیات کی ترجمانی

۱۹۔ماحول سے وابستگی

۲۰۔موسمیاتی اتار چڑھاؤ

۲۱۔انسان کا ذاتی مفاد فطرت کے لیے خطرہ

۲۲۔فطرت کی انفرادیت

۲۳۔ماحول کی بہتری کے لیے متن میں انسانی احتساب کے لیے کون کون سے اخلاقی حصے موجود ہیں؟

ان مضامین کے نظریات کا اطلاق سہ ماہی ادبیاتِ اطفال(۲۰۲۲ء۔۲۰۱۸ء) کے شماروں کی طبع زاد نظموں اور کہانیوں پر کیا جائے گا اور اس کی مدد سے ادبیاتِ اطفال میں موجود ماحولیاتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔

مجوزہ تحقیق کے لیے سہ ماہی ادبیاتِ اطفال(۲۰۲۲ء۔۲۰۱۸ء) کے شمارے منتخب کیے گئے ہیں۔ان شماروں میں حمد و نعت، طبع زاد نظمیں، کہانیاں، عالمی ادب اور پاکستانی ادب سے تراجم شامل ہیں۔ تاہم مجوزہ تحقیق کو صرف طبع زاد نظموں اور کہانیوں تک محدود کیا گیا ہے۔انھی کے حوالے سے ادبیات اطفال کا مطالعہ کیا جائے گا اور شمارہ جات کا تعارف اگلے ابواب میں شامل کیا گیا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔خالد اقبال یاسر،جدید تحریکات اور اقبال(لاہور:ادارہ ثقافتِ اسلامیہ،۲۰۲۵ء)،ص۱۴۵۔

۲۔https://www.tallahassee.com ، طلح حسن،بتاریخ۶ستمبر ۲۰۲۵ءبوقت ۱۱:۲۳

۳۔ Tintern-abbey, https://www.poetryfoundation.org/poems۔بتاریخ

۶ستمبر ۲۰۲۵ءبوقت ۱۱:۲۳

۴۔https://www.poetryfoundation.org/poems/45521/i-wandered-lonely-
as-a-cloud،نظم،بتاریخ۲۳جون ۲۰۲۴ءبوقت ۱۱:۵۵

۵۔https://poemanalysis.com/william-
wordsworth۔،نظم،بتاریخ۲۳جون ۲۰۲۵ءبوقت ۱۱:۲۳

۶۔https://www.poetryfoundation.org/poems/43986/frost-at-midnight ۔ نظم،
تاریخ۲۹جون ۲۰۲۴ءبوقت ۱۱:۳۳۔ .

7. https://www.poetryfoundation.org/poems/45146/to-a-skylark
،نظمیں،بتاریخ۲۸جون ۲۰۲۴ءبوقت ۱۰:۳۴

۸۔https://www.rekhta.org/nazms/ek-shaam-allama-iqbal-nazms-
۔216?lang=ur۔ایک شام،ریختہ لغت،بتاریخ۲۸جون ءبوقت ۱۰:۳۶

۹۔https://www.rekhta.org/nazms/shabnam-aur-sitaare-allama-iqbal-
nazms-175?lang=ur،شبنم اور ستارہ،ریختہ لغت،بتاریخ۲۸جون ۲۰۲۴ءبوقت ۱۰:۳۸۔

۱۰۔https://www.rekhta.org،دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے،ریختہ لغت،بتاری۶ستمبر ۲۰۲۵ءبوقت ۸:۴۴

۱۱۔https://www.rekhta.org/nazms،جگنو،ریختہ لغت،بتاریخ۶ستمبر ۲۰۲۵ءبوقت ۸:۴۹

۱۲۔ https://www.rekhta.org/ghazals، فیض احمد فیض، ریختہ لغت، بتاریخ ۳ ستمبر ۲۰۲۴ء بوقت ۲:۳۴

۱۳۔ جعفر حسین، مترجم، نہج البلاغہ (راولپنڈی: مرکزِ افکار اسلامیہ، ۲۰۲۰ء)، ص ۲۹۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۹۱۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۴۵۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۳۲۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۶۱۔

۱۸۔ زوار حسین، "فطرت کا جمالیاتی تکلم" مشمولہ ماہِ نو، ش ۷ (جولائی ۱۹۹۷ء)، ص ۳۱۔

۱۹۔ https://hub.edubirdie.com/examples/helen-keller-three-days-to-see، بتاریخ ۴ ستمبر ۲۰۲۵ء بوقت ۱۹:۰۹۔

۲۰۔ زوار حسین، "فطرت کا جمالیاتی تکلم" مشمولہ ماہِ نو، ش ۷ (جولائی ۱۹۹۷ء)، ص ۳۱۔

۲۱۔

https://iqbalrahber.com/payam-e-mashriq-mohavira-mabain-khuda-o-insaan.php ، پیامِ مشرق، بتاریخ ۲۹ جون ۲۰۲۴ء وقت ۱۱:۳۰

۲۲۔ القرآن سورۃ الانبیاء آیت ۳۱۔۳۲

۲۳۔ جے ایل چیپمین (J.L.Chapman)، ایم، جے ریائس (Michael J.Resis)، Ecology,principal and applications (کیمبرج یونی ورسٹی ۲۰۰۰ء)، ص ۲۔

۲۴۔ محمد ہاشم قرشی، انسان اور اس کا ماحول (نئی دہلی: فاؤنڈیشن فار ایجوکیشنل ڈولپ منٹ، ۱۹۹۳ء)، ص ۸۔

۲۵۔ جے ایلچیمین(J.L.Chapman)،ایم،جے ریائس(Michael J.Resis)، Ecology,principal and applications(کیمبریج یونی ورسٹی ۲۰۰۰ء)،ص ۲۲۔

۲۶۔ ایضاً،ص ۲۳۔

۲۷۔ ایضاً،ص ۲۷۔

۲۸۔ ایضاً،ص ۳۰۔

۲۹۔ جمیل جالبی،قومی انگریزی اردو لغت(اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۴ء)،ص ۶۴۶۔

۳۰۔ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی،اردو ادب :ماحولیاتی تناظر(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۲۲)،ص ۱۴۔

۳۱۔ جے ایلچیمین(J.L.Chapman)،ایم،جے ریائس(Michael J.Resis)، Ecology,principal and applications(کیمبریج یونی ورسٹی ۲۰۰۰ء)،ص ۲۸۔

۳۲۔ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی،اردو ادب :ماحولیاتی تناظر(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۲۲)،ص ۱۴۔

۳۳۔ ایضاً،ص ۱۴۔

۳۴۔ ایضاً،ص ۱۵۔

۳۵۔ ایضاً،ص ۷۔

۳۶۔ ایضاً،ص ۱۲۔

۳۷۔ ایضاً،ص ۲۳۴۔

۳۸۔ ایضاً،ص ۲۳۴۔

۳۹۔ ایضاً،ص ۲۳۶۔

۴۰۔ ایضاً،ص ۲۳۶۔

۴۱۔ ایضاً، ص۲۳۷۔

۴۲۔ ایضاً، ص۲۳۸۔

۴۳۔ ایضاً، ص۲۴۳۔

۴۴۔ ایضاً، ص۲۳۹۔

۴۵۔ ایضاً، ص۲۴۳۔

۴۶۔ ایضاً، ص۱۴۔

۴۷۔ ڈاکٹر نیر عباس، "ماحولیاتی تنقید :انتظار حسین کے تناظر میں "مشمولہ تحقیق نامہ ،ش ۲۱ (جولائی تا دسمبر۲۰۱۷ء)، ص۱۸۔

۴۸۔ ایضاً، ص۱۸۔

۴۹۔ ایضاً، ص۱۹

۵۰۔ ایضاً، ص۱۴۔

۵۱۔ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی،اردو ادب :ماحولیاتی تناظر (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۲۲)، ص۱۰۔

۵۲۔ ایضاً، ص۱۱۔

۵۳۔ ڈاکٹر نیر عباس، "ماحولیاتی تنقید :انتظار حسین کے تناظر میں "مشمولہ تحقیق نامہ ،ش ۲۱ (جولائی تا دسمبر۲۰۱۷ء)، ص۱۸۔

۵۴۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی،اردو ادب :ماحولیاتی تناظر (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۲۲)، ص۱۰۔

۵۵۔ صوفیہ یوسف ،"حجاب کا ناول پاگل خانہ اور ماحولیاتی تنقید"،مشمولہ الماس۔ش۱۹(یکم اگست ۲۰۱۷ء)، ص۸۹۔

۵۶۔شاہد اقبال، "ادبِ اطفال،روایت و مسائل https://www.urdulinks.com ،بتاریخ ۷ ستمبر ۲۰۲۵ء بوقت ۴:۱۶۔

۵۷۔شاہد اقبال، "ادبِ اطفال،روایت و مسائل https://www.urdulinks.com ،بتاریخ ۷ ستمبر ۲۰۲۵ء بوقت ۴:۱۶۔

۵۸۔شاہد اقبال، "ادبِ اطفال،روایت و مسائل https://www.urdulinks.com ،بتاریخ ۷ ستمبر ۲۰۲۵ء بوقت ۴:۱۶۔

۵۹۔ اعزاز باقر،مترجم،نوم چومسکی کے خطبات ماحولیاتی بحران (لاہور:مشعل بکس ،۲۰۲۱ء)،ص ۱۱۵۔

۶۰۔ گوگا،نینا۔(Nana Goga)،لکے گوانیو(Lykke Guanio)،اسلنگ نیرنیس،(Aslang Nyrnes)، Ecocritical Perspective on Children's Text and culture۔ناروے: پالگریومیک میلن،۲۰۱۸ء۔

۶۱۔ایضاً،ص ۵۵۔

۶۲۔ایضاً،ص ۵۶۔

۶۳۔ایضاً،ص ۶۷۔

۶۶۔ایضاً،ص ۱۰۲۔

باب دوم

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال (۲۰۲۲ء۔۲۰۱۸ء) میں فطرت سے متعلق شعور کا مطالعہ بحوالہ نظم

تعارف:

سہ ماہی ادبیات اطفال بچوں کے لیے لکھا جانے والا سہ ماہی رسالہ ہے جو اکادمی ادبیات اسلام آباد سے سن ۲۰۱۷ء میں جاری کیا گیا۔ فطرت یا ماحول کے متعلق شعور اور آگاہی کے حوالے سے اس رسالے کا حصہ نظم اہم حیثیت رکھتا ہے۔ زیر نظر تحقیق میں جولائی ۲۰۱۷ء سے جون ۲۰۲۳ء تک شائع ہونے والے ۲۴ جریدوں کا مطالعہ کیا گیا ہے جن میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۲۲ء تک بچوں کے حوالے سے لکھی گئی مختلف نظمیں اور کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے ۷۵ سال پورے ہونے پر شمارہ جات اٹھارہ، انیس، بیس اور اکیس کو ڈائمنڈ جوبلی کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ حصہ نظم کی بات کی جائے تو متذکرہ بالا ۲۴ رسالوں میں کل ۱۹۶ نظمیں شامل کی گئی ہیں جن میں سے ۸۵ نظمیں فطرت اور ماحول کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال، اسلام آباد (۲۰۲۲ء۔۲۰۱۸ء)	
کُل جریدے	۶۴
کُل نظمیں	۱۹۴
فطرت اور ماحول کے حوالے سے لکھی گئی نظمیں	۸۵

ان نظموں میں ماحول اور فطرت سے متعلق بچوں میں شعور پیدا کرنے اور فطرت کے بکھرے ہوئے رنگوں اور مظاہر کے ذریعے بچوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ فطرت نے ہر دور میں فطرت پسند شعرا اور ادیبوں کو متاثر کیا ہے۔

ادبیاتِ اطفال کے رسالوں میں شعرا نے سب سے زیادہ توجہ موسموں اور مختلف اوقات (صبح، دوپہر، شام) پر دی۔ ان نظموں میں زمینی اور آبی جانوروں اور چڑیا گھر جیسے موضوعات پر ۲۴ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ تتلیوں، جگنوؤں

اور شہد کی مکھی پر دس نظمیں، خوب صورت پرندوں پر گیارہ جب کہ سمندر، دریا اور ندیوں وغیرہ پر پانچ نظمیں ان رسالہ جات میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف نظاروں پر آٹھ،، پھولوں پر تین اور دنیا کے متعلق ایک نظم لکھی گئی۔ اس طرح خلا کے حوالے سے سورج کے متعلق ایک نظم جب کہ چاند سے دو نظموں کا رشتہ جوڑا گیا۔

ان رسالہ جات کی ستاسی نظموں میں سے صرف ایک نظم "آؤ بچوں پیڑ لگائیں" درخت کے حوالے سے صاحبزادہ سمیع الوریٰ نے لکھی۔ درخت فطرت کا ایک ایسا مظہر ہیں جو موسموں کو معتدل رکھتے ہے، بارش برساتے ہیں اور پھر بات جگنو، پھولوں، تتلیوں اور بلبلوں تک جاتی ہے۔ لگتا ہے نو آبادیات کا زمانہ ہو یا آزادی کا درخت ہر دور میں مظلوم رہے ہیں ان نظموں میں جنگلات کا ذکر ثانوی حیثیت میں آیا ہے۔

فطرت سے متعلق شعور کا مطالعہ:

فطرت کے متعلق شعور کا مطالعہ اس دور کی اہم ضرورت ہے تا کہ بچے مستقبل کے ایک ذمے دار شہری کے طور پر فطرت کا تحفظ کریں۔ اُن کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ہمارے ارد گرد موجود فطرتی عناصر مثلاً جنگلات، پہاڑ، دریا، سمندر، جانور، چرند پرند، ہوا اور پانی سب قدرت کے تحفے ہیں جو انسان کے لیے بہت ضروری ہیں۔ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال کی کہانیاں اور نظمیں بچوں میں فطرتی آگاہی پیدا کرنے کے حوالے سے ایک تربیتی نظام پیش کرتی ہیں۔ ادریس بابر نے فطرت اور انسان کے باہمی تعلق کو اپنی نظم "تتلی اور لڑکی" میں بہت سادہ انداز میں پیش کیا ہے ۔اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تتلی نے لڑکی کو دیکھا　　بالکل ننھی منی پری
کیسے اس کو پاس بلائے　　اس نے اپنے دھیان میں ہی
رنگ برنگے پنکھ پھیلائے　　فوراً اڑ جائے گی تتلی
لڑکی پہلے تھوڑی سی ڈری　　پھر اس نے شانے اچکائے
توڑا قریب سے گھاس کا تنکا　　یوں آغاز ہوا اک دن کا[1]

اس نظم کے مطابق تتلی نے بچی کو دیکھا جو تتلی کو ایک ننھی پری دکھائی دی۔ اس بچی کو متوجہ کرنے کے لیے اپنے رنگ برنگے پر پھیلائے۔ اس طرح بچی تتلی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نظم میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ بچی نے تتلی کو پکڑا نہیں بلکہ بچوں میں شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف رنگوں سے مزّین تتلی خدا کی بے حد پیاری، نازک اور خوبصورت تخلیق ہے۔ دنیا بھر میں جہاں تتلی کو پانی، پھول اور باغات میسر ہوتے ہیں یہ وہاں موجود

ہوتی ہے۔ تتلی کے رنگ برنگے پر مختلف پھولوں کی طرح ہوتے ہیں تتلی پھولوں پر بیٹھتی ہے پھول تتلی کی آرام گاہ ہیں جیسے انسان کرسی پر تھک ہار کر بیٹھے تو سکون اور آرام محسوس کرتا ہے۔

تتلی رنگ رنگیلی ہے　　کالی نیلی پیلی ہے
پھولوں میں یہ رہتی ہے　　ان سے دل کی کہتی ہے
بچے اس کو جانے ہیں　　اس کے وہ دیوانے ہیں
وہ معصوم سے دیکھو تو　　پکڑو تو پھر چھوڑ بھی دو[۲]

بچوں کو فطرت کے اس خوب صورت اور نرم و نازک مظہر یعنی تتلی کے متعلق شعور اور آگاہی فراہم کرنا ایک دل کش اور مؤثر طریقہ ہے کیوں کہ تتلی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ فطرت کا ایک حساس اور اہم حصہ بھی ہے ہے تتلیاں بچپن کو رنگین اور پر لطف بناتی ہے اور فطرت سے ان کو جوڑے رکھتی ہے۔ تتلیاں مختلف ممالک میں مختلف رنگوں کی ہوتی ہیں پاکستان میں تقریباً چار سو سے زائد اقسام کی تتلیاں پھولوں سے ملاقات کرتی نظر آتی ہیں اس نظم میں شاعر نے بچوں میں یہ شعور اور آگاہی پیدا کرنے کی سعی کی ہے کہ فطرت سے لطف اندوز ہونے کے بعد اس کو نقصان پہنچانے سے گریز کرنا چاہیے یعنی تتلی کو پکڑنے کے بعد اسے قید نہیں کرنا بلکہ چھوڑ دینا چاہیے۔ تتلی اور پھول کا رشتہ فطرت کی دوستی کا حسین و جمیل نمونہ ہے بیری کامنر (Barry Commoner) کے اصول کے مطابق فطرت کی ہر چیز ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہے اسی طرح پھول اور تتلی بھی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں:

تتلی پیاری پیاری تتلی　　سب کی لاج دلاری تتلی
رنگ برنگے پر ہیں اس کے　　پھول سبھی یہ گھر ہیں اس کے[۳]

بچوں میں نظموں کے ذریعے تتلیوں کے حوالے سے ماحولیاتی شعور بیدار کرنا ایک مؤثر انداز ہے۔ تتلیاں نہ صرف دل کش رنگوں کا مظہر ہیں بلکہ وہ موسمیاتی تبدیلیوں اور ماحولیاتی توازن کے حساس اشارے بھی سمجھی جاتی ہیں ان نظموں کے ذریعے یہ کوشش کی گئی ہے کہ بچوں کو پھولوں اور تتلیوں کا تعلق سمجھ میں آجائے۔ یہ پھولوں کا رس چوستی ہیں اور ایک پھول سے دوسرے پھول پر جا بیٹھتی ہیں جس کی وجہ سے پھولوں کی افزائش میں مدد ملتی ہے

تتلیوں کا کم ہونا ماحولیاتی بگاڑ کا سبب بن سکتا ہے۔ ریاض حسین قمر نے بھی اپنی نظم میں تتلی کے خدوخال کی تعریف کی ہے۔

چمن میں اڑتی ہے رنگین تتلی ہے خوشبو کی بڑی شوقین تتلی
چمن میں ہر طرف وہ گھومتی ہے وہ اک اک پھول کا منہ چومتی ہے
ہے ریشم کی طرح نرم و ملائم اسی سے باغ کی رونق ہے قائم
نہ دیکھی جائے اس کی بے قراری جہاں بھی ہو قمر لگتی ہے پیاری [۴]

تتلی خوش بو کی دلدادہ ہے اور پھولوں کی عاشق ہے، یہ ریشم کی طرح نرم و ملائم وجود رکھتی ہے۔ جہاں بھی نظر آتی ہے بھلی لگتی ہے۔ جس جگہ بھی خوب صورت اور دلکش تتلیاں ہوں وہاں کا ماحول صاف ستھرا ہوتا ہے ان نظموں کے ذریعے بچوں میں فطرت سے محبت کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

باغ میں دیکھو تتلی آئی رنگ بھی کیسے کیسے لائی
اڑتی اڑتی پھول پہ پہنچی کان میں اس کے بات سنائی
گاتی پھری ہے بادِ سحر جس دم تتلی باغ میں آئی [۵]

فریدہ گوہر نے اپنی نظم "تتلی" میں دل کش رنگوں، باغ، پھولوں اور بادِ سحر کا ذکر کیا ہے۔ اس نظم میں تتلی کو زندگی اور تازگی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے یعنی یہ باغوں کی رونق ان میں بسنے والی مخلوق سے ہوتی ہے۔ جب تتلی باغ میں آتی ہے تو اپنے پروں کے ذریعے مختلف رنگ ساتھ لاتی ہے وہ پھولوں سے سرگوشی کرتی ہے تتلی کی آمد پر نہ صرف بادِ صبا گنگنا رہی ہوتی ہے بلکہ شاخیں، پتے، چڑیا، کوئل، مینا اور طوطے سب اس کی آمد پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ خوب صورت رنگوں اور دیدہ زیب نمونوں سے مزّین انتہائی نازک پروں والی چھوٹی سی تتلی پھولوں پر آبیٹھے، پھول اور کلیاں بھی مختلف رنگ بکھیر رہے ہوں، سبز پتوں کی آغوش میں پھولوں کے رنگ مزید خوش نما اور دل کش لگ رہے ہوں تو وہ کون ہے جس کو فطرت کے حسین امتزاج کی کشش اپنی طرف کھینچ نہ لے۔ بڑوں کو تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ پھول اور تتلی بہت نازک ہیں اور پھول شاخوں پر اور تتلی پھولوں پر اچھی لگتی ہے۔ تتلیوں کو پکڑنے سے اُن کے پر خاک ہو جائیں گئے مگر بچوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے وہ اسے پکڑنے کی جستجو کرتے ہیں

بعض دفعہ تتلی اُڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور بعض اوقات ہاتھوں میں قید ہو کر اپنے نازک پروں سے محروم ہو جاتی ہے۔

تتلی کی دلکشی، خوب صورت پروں، خوش بو اور پھولوں سے اس کا فطری تعلق ان اشعار کا موضوع ہے۔ نیز بچے تو کیا بڑے بھی تتلی کو پکڑنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ان اشعار میں بچوں کو یہ تاکید بھی کی گئی ہے کہ اگر وہ تتلی کو پکڑیں تو جلد ہی اسے آزاد کر دیں۔ تتلی ایک نازک مخلوق ہے اور اس کو پکڑنے سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ان نظموں میں یہ اشعار نہیں ملتے کہ ایسے معدوم ہونے سے بچانا کیسے ہے، تتلیوں کے مسکن اور تتلیوں کا تحفظ کیسے ممکن ہے۔

بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتے ٹمٹماتے جگنو اور رنگ بکھیرتی رومان پرور تتلیاں قدرت کی عظمت اور کاریگری کو ثابت کرتا ہے۔ رسالے میں جان کاشمیری نے روشنی کے سفیر کے متعلق خوب صورت نظم لکھی۔

روشنی بانٹے شب بھر ہر سو　　چاند کے گھر کا فرد ہے جگنو
اس کا بدن ہے روشن ایسے　　نور کا کوئی ذرہ ہو جیسے
رات اندھیری خوف نہیں　　تن میں روشن شمعِ یقیں
جگ مگ جگ مگ اڑتا جائے　　راہِ منزل سب کو دکھائے[۶]

جگنو تتلی کے خاندان کا ایک چھوٹا سا کیڑا ہے جو رات کو چمکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ پروردگارِ عالم کی حیران کر دینے والی تخلیق ہے جگنو کے جسم میں ایک مخصوص عضو جو اس کے پیٹ کے آخری حصے میں ہوتا ہے یہ روشنی مہیا کرتا ہے اس عمل کو بایولومینیسنس (Bioliminescence) کہتے ہیں جس کے اندر روشنی مسلسل جلتی رہتی ہے۔ یہ اکثر معتدل آب وہوا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ دریا اور ندیوں کے کنارے رات کی تاریکی میں محوِ پرواز نظر آتا ہے۔ رات کا یہ مسافر پھولوں کی انجمن کا دیوانہ ہے تھک ہار کر پھول پر بیٹھ جاتا ہے۔ اندھیری راتوں میں لگتا ہے کہ پھولوں کی محفل میں دیا جل رہا ہو۔ جان کاشمیری نے اس نظم کے ذریعے بچوں میں جگنو کے متعلق شناسائی، شعور اور آگاہی پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ جگنو رات بھر روشنی بانٹ رہا ہوتا ہے جیسے چاند کے گھر کا فرد ہے یہ چھوٹا سا چاند نور کے ذرہ کی مانند ہے روشنی دینے کی خصوصیت کی وجہ سے جگنو کو چاند کہا گیا ہے۔ نیز اس نظم میں بچوں کی کردار سازی کی طرف بھی توجہ دی ہے کہ ظلمت اور مشکلات میں خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے نہ گھبرانہ چاہیے دل میں میں یقین کی شمع روشن ہو تو تاریک اور سنگلاخ راستوں میں چل کر انسان اپنی منزل پالیتا ہے بلکہ بھٹکے ہوؤں کو بھی نشانِ منزل سے آشنا کر سکتا ہے۔

علامہ محمد اقبال نے روشنی کے سفیر اس چھوٹے سے کیڑے کو بانگِ درا میں اپنی نظم "جگنو" میں موضوع سخن بنایا ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں[۷]

اس نظم میں علامہ اقبال نے جگنو کو کہیں آسمان سے اترا ہوا تارا اور کہیں چاند کی کرن کہا جو آسمان سے اتر آئی ہو۔ مصورِ خدا نے نے اس عجیب و غریب مخلوق کو پیدا کیا اور اپنی قدرت سے اسے خلوت سے انجمن میں لے کر آیا۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے جگنو کی صلاحیت کو مشعل راہ بناتے ہوئے زندگی کے کچھ اصول وضع کیے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ پروانہ روشنی کا طلب گار ہے اور روشنی کے لیے اپنی جان دے دیتا ہے جب کہ جگنو خود روشنی ہے۔ انسان کے لیے علم روشنی ہے۔ قلب سلیم کے ساتھ علم و شعور سے انسان کو اپنی شناخت ہوتی ہے اور اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے رب کی شناسائی حاصل کرتا ہے اور وہ دوسروں کے لیے مشعل راہ بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال بھی کولرج کی طرح فطرت کو بطور استاد دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کی ایک اور نظم بلبل اور جگنو جو کبھی درسی کتب کی زینت ہوا کرتی تھی یہ نظم آج بھی بچوں کے لیے دل چسپ اور اہم ہے۔

نظام شمسی میں سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ افق دہلوی نے اپنی نظم میں "سورج" کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

بہت دور ہے گرچہ سورج زمیں سے — نظر پھر بھی آتا ہے یہ ہر کہیں سے
زمیں سے حقیقت میں لاکھوں گنا ہے — سمجھ میں نہیں آتا کتنا بڑا ہے
زمیں اس کے چاروں طرف گھومتی ہے — زمیں پر اسی واسطے روشنی دے
بدلتا ہے یہ چاروں موسم ہمارے — اسی کی بدولت ہیں دن رات سارے
اندھیرا اجالا اسی کے ہے دم سے — نکلتا ہے مشرق سے رب کے کرم سے[۸]

سورج نظام شمسی کا وہ روشن ترین ستارہ ہے جس کا وجود ہماری زمین کے وجود کے لیے لازمی ہے۔ یہ ستارہ زمین سے کئی گنا بڑا ہے اور زمین اس کے گرد اپنے مدار میں گھومتی ہے جس سے زمین پر موسم بدلتے اور ماہ و سال گزرتے ہیں۔ فطرت کا پورا پورا انحصار اس ستارے پر ہے۔ زمین پر موجود تمام مخلوقات سورج کی محتاج ہیں اور اس کے بغیر زندگی کا وجود ممکن نہیں۔ اس سب کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر فطرت کے قوانین کی پاسداری نہ کی جائے تو سورج اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود زمین کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اُفق دہلوی نے جدید سائنس کی روشنی میں سورج سے نکلنے والی الفا، بیٹا اور گاما شعاعوں کا تذکرہ کیا ہے جو زمین اور اس کی تمام مخلوقات کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہیں۔ سائنسی علوم سے ثابت ہے کہ سورج سے نکلنے والی ان خطرناک شعاعوں کے مضر اثرات

سے اوزون کی تہہ انسانوں، دوسرے جانداروں اور نباتات کو تحفظ دیتی ہے ۔ بڑھتی ہوئی آبادی، ماحولیاتی آلودگی، فیکٹریوں، گاڑیوں اور کارخانوں کا دھواں، کوئلے کا صنعتی استعمال، درختوں کی کٹائی، فضائی آلودگی، زہریلی گیسیں اور دیگر عوامل نے زمین کی حفاظت کرنے والی اوزون تہہ کو نقصان پہنچایا ہے جس کی وجہ سے سورج کی تیز شعاعیں زمین تک پہنچ کر تباہی کا باعث بنتی جارہی ہیں۔ یہ شعاعیں مختلف بیماریوں کینسر، جلد کی مختلف بیماریاں اور سانس کی بیماریوں کا سبب بنتی ہیں نیز یہ پودوں اور درختوں کی نشوونما کو روک دیتی ہیں۔ انسان کی غفلت سے اوزون کی تہہ کو شدید نقصان پہنچا جس کی وجہ سے زمین پر موجود فطرت کے مظاہر مختلف خطرات سے دوچار ہیں۔

چاند فلک پر نکلا ہے — لے کے اجالے ابھرا ہے
شب کا دامن روشن اس سے — گھر کا آنگن روشن اس سے
اس کی بچو عظمت دیکھو — اس کی شان و شوکت دیکھو
لُو پھٹنے پر کھو جاتا ہے — جانے کہاں یہ سو جاتا ہے[9]

جب رات کو چاند نظر آتا ہے تو میرے دل میں اتر جاتا ہے اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے کبھی یہ ہلال کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی چودھویں کے چاند کی صورت میں نظر آتا ہے زمین پر بسنے والوں پر چاندنی یہ چاند کا احسان ہے۔ چاند فطرت کا ایک حسین عنصر ہے جس نے ہمیشہ انسان کو اپنی طرف راغب کیے رکھا ہے۔ یہ ادب میں حُسن کا استعارہ رہا ہے اور قدرت کے حسین مظاہر میں سے ایک ہے۔ چاند اور چاندنی انسان کے لیے سکون اور محبت کا ذریعہ رہے ہیں۔ جدید دور میں لوگ ٹیکنالوجی سے اس قدر جڑ گئے ہیں کہ اب چاند کو دیکھنا یا اس سے لطف اندوز ہونا بہت کم ہو گیا ہے۔ آج کل بچوں میں موبائل فون اور کمپیوٹر کی اسکرین کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ ذاتی دلچسپی کی سرگرمیوں سے لے کر تعلیمی معاملات سب موبائل کی اسکرین پر انجام پاتے ہیں جس کی وجہ اسکرین کی اس نیلی روشنی نے بچوں کی بصارت پر مضر اثرات مرتب کیے ہیں اور انسان نے فضا کو اتنا آلودہ کر دیا ہے کہ چاند کا حُسن کچھ گہنا سا گیا ہے یہ ہی چاند بڑے شہروں کے بجائے کسی دور دراز گاؤں میں جا کر دیکھیں جہاں فضائی آلودگی نہیں ہوتی تو چاند چاند نظر آئے۔ شاعر نے اس نظم میں بچوں کی توجہ فطرت کے اس حسین مظہر کی طرف دلانے کی کوشش کی ہے۔

امبر کو چمکاتے جاؤ — لیکن دھرتی پر بھی آؤ
آؤ پاس نہ کرو اشارے — دور فلک پر بستے ستارے
تم کو اک معصوم پکارے — دور فلک پر بستے ستارے[10]

سلطان کھاروی نے اپنی نظم "دور فلک پر بستے تارے" میں ایک بچے کی آرزو کی نمائندگی کرتے ہوئے ستاروں سے مخاطب ہیں۔ انسان اور فطرت کا گہرا تعلق اس نظم میں نظر آتا ہے۔ انسان چاند ستاروں کے بارے میں نہ صرف متجسس رہا ہے بلکہ ان کو چھونے کی خواہش بھی دل میں رہی ہے۔ ایک بچے کو چاند ستاروں کو قریب سے دیکھنے یا چھونے کی آرزو ہونا فطری عمل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے بچوں کو فطرت سے جڑے رکھنے کے لیے ان میں یہ تجسس پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ شاعر مجید امجد نے اپنی نظم عنوان "تارے" میں بچوں کو چاند تاروں سے تشبیہ دی ہے۔

ے

ہم تارے، راج دلارے ہیں ہم تارے، چاند ستارے ہیں
خوش خصلت ہیں، خوش طینت ہیں ہم اس پرچم کی زینت ہیں
ہم جگ مگ کرتے تارے ہیں ہم تارے، چاند ستارے ہیں"

ستاروں کے متعلق ان دونوں نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فطرت کا انسان کے ساتھ کتنا گہرا اور پرانا رشتہ ہے۔ انسان کبھی ستاروں کو زمین پر اُتر آنے کی درخواست کرتا ہے کبھی فاصلوں کی شکایت کرتا ہے کبھی آرزو کرتا ہے اور کبھی ستاروں کو بچوں کے ساتھ منسوب کرتا ہے یہ فطرت سے انسان کی فطرتی محبت کا اظہار ہے۔ چاند اور تارے بے وفا نہیں ہاں انسان کو فضائی آلودگی پر قابو پانا ہو گا۔

آغا شید اکاشمیری نے زمین کی خوب صورتی پر "یہ دنیا" نظم تحریر کی انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ بچوں کے لیے فطرت کے سبھی رنگ اس نظم میں یکجا ہو جائیں اور وہ اپنی دنیا سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ فطرت کے ذریعے بچے اپنے رب کو پہچانے کہ جس نے اتنی خوب صورت دنیا کو خلق فرمایا۔

پہاڑ اور میداں یہ چاند اور ستارے یہ پھل پھول پودے یہ دلکش نظارے
بلندی سے گرتی ہوئی آبشاریں یہ سرسبز پیڑوں کی رنگیں قطاریں
یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ اودھی گھٹائیں ہمیں ہر گھڑی آ کے جھولا جھلائیں
یہ تازہ بہاریں یہ ساون کی جھڑیاں یہ بھادوں کے قطرے ہیں موتی کی لڑیاں
یہ نیندیں ہماری یہ سپنے ہمارے خوشی کے ہیں سامان کیا پیارے پیارے"

اس نظم میں فطرت کے کئی رنگ یکجا کیے گئے ہیں۔ اس میں بچوں کی فطرت میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس دنیا کی دلکشی اور خوب صورتی کو فطرت کے مطابق قائم رکھنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ انسان نے فطرت کے معاملات میں دخل اندازی کی ہے، اس نے پہاڑوں کو کھوکھلا کر دیا اور سمندروں اور فضاؤں کو آلودہ کر دیا ہے۔ ہوائیں، بادل، موسم، بہاریں، درخت، پھول، پرندے، تتلیاں، جگنو، دریا، سمندر، پہاڑ سبھی انسان سے ناراض ہیں کیوں کہ یہ دنیا اور یہ زمین صرف انسان کی نہیں ہے بلکہ تمام حیوانات، چرند پرند، نباتات، پانی اور ہوا سب کی ہے یہاں سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ یہ چرند پرند، حیوانات، نباتات سے بھری ہوئی ہے زمین کا ہر موسم دل کش ہے سردیوں کی برف باری، گرمیوں میں چمکتا سورج، بہار میں رنگ برنگے پھولوں کا کھلنا اور خزاں کے سہنری پتے زمین کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ زمین کے نہ صرف نظارے دیدہ زیب ہیں بلکہ یہ مہربان بھی ہے یہ انسانوں اور دیگر جانداروں کو کھانے کے لیے خوراک، پینے کے لیے صاف پانی اور رہائش کے لیے جگہ مہیا کرتی ہے۔ بلاشبہ ہماری زمین ایک خوب صورت سیارہ ہے جہاں زندگی کے بے شمار حَسین رنگ بکھرے ہوئے ہیں لیکن آج ہماری زمین کو مختلف ماحولیاتی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان مسائل میں فضائی آلودگی، آبی آلودگی، جنگلات کی کٹائی، عالمی حدت اور پلاسٹک کی آلودگی شامل ہے ماحولیاتی مسائل سنگین نوعیت کے ہیں ماحولیاتی تحفظ کے لیے اقدامات کرنے چاہیے تاکہ آنے والی نسلوں کا مستقبل محفوظ بنایا جاسکے۔

دریا حیاتیاتی تنوع، موسم کی ترتیب، زمین کی زرخیزی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دریاؤں کے باعث درجہ حرارت معتدل رہتا ہے۔ دریا جیسے انمول تحفے کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے ضیاء الحسن نے نظم "دریا" لکھی۔ دریا کی اہمیت پر اشعار ملاحظہ ہوں:

بہہ رہے ہیں زمین پر دریا　　ہم پہ احسان کتنا ہے رب کا
فائدے ان گنت ہیں پانی کے　　اصل میں زندگی ہے یہ پانی
کوہساروں سے بہہ کر آتے ہیں　　اور سمندر میں منھ چھپاتے ہیں[۳]

دریا قدرت کا انمول تحفہ ہیں اس دنیا میں دریاؤں کی شکل میں پانی کا موجود ہونا انسان پر خدا کا احسان ہے۔ پانی قدرت کا ایسا تحفہ ہے جس کا کوئی مول نہیں۔ دریا جانداروں کے لیے تازہ پانی فراہم کرتے ہیں اور زمین اسی کی وجہ سے سر سبز اور پُر رونق ہے یہ بنجر زمین کو باغ بنا دیتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے لیے دریاؤں کی اہمیت بہت زیادہ ہے یہ کھیتوں کو سیر اب کرتے ہیں۔ اسی لیے زرعی علاقے دریاؤں کے آس پاس آباد ہوتے ہیں کیوں کہ وہاں پانی آسانی سے دستیاب ہوتا ہے۔ دریاؤں کے ذریعے بجلی پیدا کی جاتی ہے جس کی وجہ سے فضائی آلودگی نہیں پھیلتی۔ دریا بارش کے

نظام کو متوازن رکھنے، نمی کو برقرار رکھنے اور زمین کے درجہ حرارت کو معتدل رکھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ اس نظم میں بچوں کو دریا کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا ہے اور ان میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فطرت کے دیگر مظاہر کے ساتھ ساتھ دریاؤں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ندیاں اور دریا قدرت کے خزانے ہیں۔ندیا فطرت کے حُسن کی ایک جھلک ہے۔ ظہیر کاشمیری کی نظم "ندیا بہتی جائے" میں ندیا کے حُسن کی جھلک کو اُن کے اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے:

پربت پر لہروں کے گھنگرو　　چھن چھن چھن چھنکائے
میداں پر امرت برسا کر　　پھول ہی پھول کھلائے
ندیا بہتی جائے[۱۴]

ندیا فطرت پسند شعرا اور ادیبوں کی تحریروں میں خوب صورتی اور رومانویت کے استعاروں میں شامل ہے۔اس نظم میں شاعر نے ندی کی خوب صورتی اور اس کی چال ڈھال بچوں کے ذہن میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ جب ندیا پہاڑوں سے اترتی ہے تو اس کا پانی تیز ہوتا ہے جس کی وجہ سے چھن چھن کی آواز آتی ہے اور جب وہ میدانوں سے گزرتی ہے تو اس حیات بخش اور فرحت بخش پانی سے ہر طرف پھول کھلتے ہیں یہ بل کھاتی جاتی ہے کشتی، ہوا اور پرندے اس کے سنگ سنگ چلتے ہیں۔ ندی دوسروں کی پیاس بجھاتی ہے مگر بارشیں خود ندی کی تشنگی دور کرتی ہیں۔ ندیا صحراؤں کا حُسن ہے اور انسان کے لیے بستیاں بنانے کا باعث بنتی ہے اور آخر کار ساغر یعنی سمندر کا حصہ بن جاتی ہے۔ ندیاں صنعت، پینے کے صاف پانی اور زراعت کے لیے اہم ذریعہ ہیں۔ان میں آبی پودے، بے شمار اقسام کی مچھلیاں اور دیگر جاندار پائے جاتے ہیں اور یہ موسموں کے توازن میں مدد دیتی ہیں۔ ندیوں پر بند بنا کر بجلی پیدا کی جاتی ہے جو توانائی کا ذریعہ ہے ماحولیاتی تبدیلی نے ندیوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ ندیوں کی حفاظت کے لیے یہ شعور اجاگر کرنا ضروری ہے کہ ماحولیاتی قوانین پر عمل کرنا چاہیے اور ندیوں کے اردگرد صفائی کا خاص خیال رکھا جائے اور ان کنارے درخت لگائے جائیں کیوں کہ ان کا تحفظ نہ صرف ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے کیا جائے بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کی بقا کے لیے یہ بہت ضروری ہے کیوں کہ ندیاں صرف پانی کا بہاؤ نہیں زندگی کا بہاؤ بھی ہیں۔

دیکھو بچو! بہتا پانی　　گیت سنائے اس کی روانی
رستے میں ہرگز نہ رکے گا　　منزل پہ جا کے دم لے گا
جہدِ مسلسل اس سے سیکھو　　بڑھتے جاؤ آگے بچو[۱۵]

ان اشعار میں عمران کمال نے بہتے پانی کی روانی اور بہتے پانی کے شور کو گیت سے تشبیہ دی ہے اور فطرت کو بطورِ استاد کے اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بچوں میں شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے ہے کہ منزل کا درست تعین، منزل پر نظر ہونا، تمام رکاوٹوں کی پرواہ کیے بغیر اُنھیں عبور کرنا اور جہدِ مسلسل کے ساتھ آگے بڑھتے رہنا یہ اوصاف دریاؤں سے سیکھو اسی میں کامیابی ہے۔ بہتے پانی کی روانی کی طرح انسان کو مستقل مزاجی اور مسلسل کوشش و محنت کا درس لینے کی تاکید کی گئی ہے۔ جس طرح بہتا پانی رستے کی کسی رکاوٹ کو خاطر میں لائے بغیر مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے اسی طرح انسان کو بھی اپنی منزل کی طرف بڑھتے جانا چاہیے۔

بچوں میں فطرت سے متعلق شعور و آگاہی کے حوالے سے اُفق دہلوی نے "سمندر" نظم تحریر کی۔ سمندر فطرت کا ایک عظیم مظہر ہے۔ ہماری زمین کا ستر فیصد حصہ سمندر پر مشتمل ہے جب کہ تیس فیصد خشکی پر۔ سمندر ہی بارشوں کا سبب بنتے ہیں تاہم اس نظم میں ادب کے حوالے سے سمندر کی تخلیق اور ارتقا کے متعلق سائنسی اصولوں کی روشنی میں اشعار تحریر کیے ہیں جن میں سے چند اشعار یہ ہیں:

زمیں پہلے گولا تھی اک آگ کا　　یہ گولا تھا سرخ اور دہکتا ہوا
یوں ہی سال ہا سال جب ہو گئے　　تو ٹھوس اور سرد اس کے حصے ہوئے
جو بادل وہاں پر تھے چھائے ہوئے　　وہ آخر زمیں پر برسنے لگے
زمیں پر گھڑے گہرے بنتے گئے　　بالآخر وہ پانی سے بھرتے گئے
افقؔ انقلاب ایسے آتے رہے　　زمیں پر سمندر بناتے رہے[۱۶]

یعنی زمین پہلے آگ کا گولہ تھی زمین کو برسوں گیسوں نے گھیرے رکھا پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کا درجہ حرارت کم ہوا بیرونی سطح ٹھنڈی ہو گی اور اندرونی حصہ گرم ہو گیا ہے میگما اور آتش فشاں وغیرہ اور یہ ہی آتش فشاں پھٹنے لگے شدید زلزلے آئے جن کی وجہ سے بڑے شگاف بن گئے۔ جب زمین مزید ٹھنڈی ہو گی تو بھاری مقدار میں پانی بخارات بن کر نکلا تو ان بخارات نے زمین پر بارش کی شکل اختیار کر لی اور مسلسل بارشوں سے سمندر، دریا اور جھلیں بننے لگی۔

دریا، سمندر اور ندیا کے متعلق درج بالا سبھی نظموں میں شعرا نے بچوں کو اُن کی فطرتی خوب صورتی اور اُن کے فوائد برائے انسان و دیگر جانداروں کے متعلق آگاہ کیا ہے لیکن ندیا، دریا اور سمندروں کو لاحق خطرات کیا ہیں اس سلسلے

میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہے کوئی بات نہیں کی گئی۔ سمندری آلودگی ایک سنگین عالمی مسئلہ ہے ہر سال لاکھوں ٹن پلاسٹک سمندروں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ کارخانوں سے خارج ہونے والے کیمیکل سمندری پانی کو آلودہ کر دیتے ہیں یہ انسانوں اور سمندری حیات دونوں کے لیے خطرناک ہیں۔ سمندر زمین کے درجہ حرارت کو معتدل رکھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں ماحولیاتی آلودگی موسمیاتی تبدیلی کا سبب بن رہی ہے۔ آبی آلودگی کی وجہ سے سمندری حیات کی بقا خطرے میں ہے۔

جیسے برسات کے بغیر فطرت کے رنگ پھیکے ہیں بلکل اسی طرح ادب بھی برسات کے ذکر کے بغیر قحط زدہ زمین کی طرح ہے۔ بارش فطرت کے حسین اور حیرت انگیز مظاہر میں سے ایک ہے۔ شعرا نے اس پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ سہ ماہی ادبیات اطفال کے چوبیس رسالوں میں چھے نظمیں بادل، برسات اور ساون کے متعلق ہیں۔ جن میں " ایک بادل کا گیت " ہے جو احمد ندیم قاسمی نے تحریر کی۔ اس نظم میں انھوں نے فطرت کے عظیم مظاہر سمندر، ہواؤں، بادلوں، پربتوں اور میدانوں کا تذکرہ کیا ہے۔

مرا گھر سمندر کی گہرائیوں میں میں رہتا تھا لہروں کی پرچھائیوں میں
کبھی سیپیوں میں کبھی کائیوں میں[۱۷]

بادل کہتا ہے کہ میں سمندر کی گہرائیوں میں رہتا ہوں میرا اصل مسکن سمندر ہے۔ میں لہروں کی پرچھائی میں رہتا ہوں کبھی سیپیوں میں اور کبھی سمندر میں لیکن مجھے سورج کی حدت اور گرم شعاؤں نے اکسایا کہ سمندر کو چھوڑو تمھیں تاروں کے دیس کی سیر کرواتے ہیں مخمور ہوائیں مجھے اُڑا لے گی۔ ستاروں کی دھن میں وطن یعنی سمندر کو چھوڑ آیا اور ہواؤں کے نشانے پر سوار ہو کر پہاڑوں پر چھا گیا۔ ایک تیز جھونکا مجھے پربت کی چوٹی پر لے گیا۔

تو پربت نے مجھ کو کچھ ایسے دھکیلا
وہ اکڑا میں گر جا وہ بپھرا میں کھیلا[۱۸]

احمد ندیم قاسمی نے انسانی جذبات، معاشرتی مسائل اور فطرت کے عناصر کو علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے اپنی اس نظم میں انھوں نے بادل کی زندگی کو انسان جیسا قرار دیا ہے جو محسوس کرتا ہے، سوچتا ہے، تھکتا ہے، محبت کرتا ہے ،اور کبھی خود کلامی کرتا ہے۔

بارش قدرت کا انمول تحفہ ہے یہ زمین کی پیاس کو بجھاتی ہے اس کے پانی سے درخت، پودے اور پھول نکھر جاتے ہیں۔ بارش زمین کے درجہ حرارت کو بڑھنے نہیں دیتی ۔ فضائی آلودگی کو کم کرنے میں مدد دیتی ہے ۔ بارش

ادب، موسیقی اور شاعری کا اہم موضوع ہے ۔ ارسلان اللہ خان نے قدرت کے اس انمول تحفے پر نظم تحریر کی "بارش آئی" اس میں انھوں نے گرمی کے بعد ہونے والی بارش کی منظر کشی کی ہے۔

بارش آئی، بارش آئی ساتھ میں پیارا موسم لائی
پتا پتا، ڈالی ڈالی کیسی ہوئی ہر جا ہریالی
ساری گرمی دور ہوئی ہے بیزاری کافور ہوئی ہے
آؤ ہم بھی جھومیں گائیں اس بارش میں دھوم مچائیں[19]

بارش کا پانی قدرتی ذریعہ ہے جو زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ زیرِ زمین پانی کے ذخائر، ندیوں اور جھیلوں کو بھرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس پانی سے فصلیں سیر اب ہوتی ہیں، پینے کے کام آتا اور بجلی پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بارش سے نہ صرف بچے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ بلبل اور دیگر پرندے خوشی کے گیت گا رہے ہوتے ہیں۔ پھولوں، پتوں اور نباتات کے رنگ نکھرے نکھرے نظر آتے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی کے بڑھنے کی وجہ سے گرمی میں اضافہ ہونے کے سبب زمین کا درجہ حرارت دن بہ دن بڑھتا جارہا ہے۔ اسی طرح کی ایک نظم نسیم شریف نے بھی "برسات" کے عنوان سے اس رسالے میں لکھی ہے جس میں بارش میں بچوں کا بھیگنا، کھیلنا اور کاغذ کی کشتیاں بنانا وغیرہ جیسی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ الطاف حسین نے نظم "ساون آیا" تحریر کی۔ برصغیر کے ادب میں ساون اور بھادوں کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ یہ دونوں برسات کے مہینے ہیں۔ جب برسات یعنی ساون کا ماہ آتا ہے تو آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھک جاتا ہے ساون کا موسم ماحول میں توازن، زمین کی زرخیزی، گرمی شدت کی کمی اور پانی کے ذخائر کی بحالی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ساون آیا، ساون آیا ساون آیا، خوشیاں لایا
ہم بھی جھومیں، ناچیں، گائیں اس موسم کا لطف اٹھائیں[20]

اس نظم میں ٹھنڈی اور کالی گھٹاؤں، موسم کی خوشگواری، جھومنے ناچنے اور بارش سے لطف اندوز ہونے کے بارے میں اشعار تحریر کیے گئے ہیں۔ ساون کے ماہ میں درختوں کو پانی میسر آتا ہے جو اُن کی آبی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ بارش کا پانی جنگلات کی ترقی میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ درخت جن کو ماحول کے پھیپھڑے کہا جاتا ہے جیسے انسانی پھیپھڑے سانس لینے میں مدد دیتے اسی طرح یہ ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے اور آکسیجن کو جذب کرتے ہیں۔ بارش زمین اور اس میں بسنے والے جانداروں کے لیے حیات ہے۔ جہاں بارش نہیں ہوتی وہاں قحط پڑتا

ہے۔ بارش فطرت کے حُسن کو دوبالا کرتی ہے، جب اس کے قطرے زمین پر پڑتے ہیں تو اس سے پر سکون اور لطف دینے والی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ فطرت کی موسیقی ہے جو مٹی کی خوشبو بھی پھیلاتی ہے۔ تاہم ان نظموں میں موسمیاتی تبدیلی اور خصوصاً بچوں پر اس کے اثرات اور ہماری ذمہ داریوں پر اشعار نہیں ملتے۔ دورِ حاضر میں بچوں میں شعور بیدار کرنا بہت ضروری ہے۔

پرندے فطرت کے حسین رنگوں میں سے قدرت کی انتہائی خوبصورت تخلیق ہے۔ جیسے ایک گھر کے آنگن میں بچے کھیلتے اچھے لگتے ہیں بلکل اسی طرح گھر کی منڈیر، جنگلات، باغات ہوں یا سنگلاخ پہاڑ، دریا، سمندر ہوں یا نیلے آسمان کی وسعتیں اور بلندیاں مختلف انواع کے چھوٹے بڑے پرندے پرواز کرتے، چہچہاتے، گنگناتے بھلے لگتے ہیں۔ دنیا بھر میں پرندے مختلف دیدہ زیب رنگوں سے مزّین ہوتے ہیں۔ پرندوں کے دلکش رنگ و روپ اور ان کی خوبصورت بولیاں فطرت کے حُسن میں جان ڈالتی ہیں۔ انسان اور پرندوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تاریخ میں اس تعلق کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں بعض روایات میں کوّا دفناتہ نظر آتا ہے یعنی حضرت آدمؑ کے بیٹے کو مردے دفنانے کا طریقہ بتانے کوّا آیا۔ کبھی ہُدہُد ملکہ بلقیس کی مخبری کرتا ہے۔ اسی طرح صدیوں سے کبوتر قاصد کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ آزاد فضاؤں میں محوِ پرواز رہنے والی اس مخلوق کو انسان نے قیدی بنا کر اپنے گھر کی آرائش و زیبائش کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ چڑیا گھروں میں چھوٹے چھوٹے پنجروں میں قید یہ قیدی حسرت بھری نگاؤں سے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ فطرت پسند شعراء اور ادیبوں نے پرندوں کے متعلق بہت کچھ لکھ ہے فطرت بطورِ استاد کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو حضرت علی کرم اللہ وجھہ نے فرمایا کہ تین چیزیں کوّے سے سیکھنی چاہیے حیا، اتحاد اور دشمن سے باخبر رہنا ۔علامہ اقبال نے شاہین کو نوجوانوں کے لیے بطورِ استاد پیش کیا ہے کیوں کہ یہ غیرت، بلند پروازی اور آزادی کی علامت ہے۔ فاختہ کی امن پسندی، مور کا رقص، بلبل کے گیت و محبت اور چڑیا کی شفقت سے انسان کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ بچوں کے لیے مختلف شعرا نے سہ ماہی ادبیاتِ اطفال میں مختلف جرائد میں تقریباً دس نظمیں پرندوں کے عنوان سے لکھی۔ فاختہ کی امن پسند اور خوب صورتی پر ضیاء الحسن ضیاء نے فاختہ نظم تحریر کی جس کے چند اشعار تحریر کیے جا رہے ہیں۔

فاختہ امن کی علامت ہے　　خوب صورت ہے، خوب سیرت سے
ملتی جلتی ہے یہ کبوتر سے　　دور سے اس کو گر کوئی دیکھے
سیدھی سادی ہے اپنی فطرت میں　　ہے کشش اس کی پیاری رنگت میں[۲۱]

اس نظم میں بچوں کو فاختہ سے متعارف کروایا گیا ہے۔ اس میں فاختہ کی خصوصیات اور اس کے خد و خال بتائے گئے ہیں۔ شاعر نے فاختہ کی فطرتی عادات بیان کر کے بچوں کی کردار سازی کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ پرندہ امن کی علامت ہے، سادہ مزاج ہے اور پر سکون رہتا ہے۔ فاختہ کی نشت و برخاست میں بہت ٹھہراؤ ہے۔ یہ پُر امن پرندہ دوسروں کو بے جا تکلیف نہیں دیتا اور نہ دوسرے پرندوں سے لڑائی بھڑائی کرتا ہے۔ یہ انسانوں سے محبت کرتا ہے اور جلد مانوس ہو جاتا ہے۔ امن کا پیامبر یہ پرندہ لالچی نہیں ہوتا۔ دوسروں کے حقوق غصب نہیں کرتا۔ گھروں کی منڈیروں اور درختوں کی شاخوں پر بیٹھ کر تھکی تھکی آواز میں گنگناتا رہتا ہے۔ آندھی طوفانوں کے خطرات کے علاوہ شاعر نے ایک شعر میں لکھا ہے کہ کوّا اس کے انڈے کھا جاتا ہے اور فاختہ کو اداس اور بے چین کر دیتا ہے مگر فاختہ حوصلہ نہیں ہارتی کیوں اسے شعور ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ آخر اس نے پُر امن زندگی گزارنی ہے وہ پھر کسی شاخ پر بیٹھے زندگی کا گیت گا رہی ہوتی ہے۔ اس نظم میں بچوں کو فطرت سے جڑے رہنے اور فطرت میں موجود اچھائیوں کو اختیار کرنے کا سبق دیا گیا ہے۔

چراغ حسن حسرت اُردو کے مزاح نگار، صحافی اور ادیب تھے۔ اُن کی شاعری میں فطرت سے محبت کا عکس نمایاں ہے۔ "ننھی اور بلبل" اُن کی خوب صورت نظم ہے جس میں ایک بلبل اور ننھی بچی کے مابین مکالمے کے انداز میں فطرت سے حسین رشتہ، محبت اور معصومیت کا منظر کشی کی گئی ہے۔ نظم فطرت سے دوستی کا بہترین نمونہ ہے۔

بلبل پیاری بلبل　　باغ کی لاج دلاری بلبل
کتنے پیارے بول ہیں تیرے　　گانے سب انمول ہیں تیرے
یہ تیرا چہکارے پھرنا　　پھول سے دل کی باتیں کرنا
اڑ کر پیڑ سے آجا بلبل　　مجھ کو گیت سنا جا بلبل [۲۲]

ان اشعار میں بچوں کو پرندوں سے محبت اور فطرت کے متعلق آگاہی دی گئی ہے۔ بلبل ایک معروف خوش الحان پرندہ ہے جو اپنی سریلی اور دل کش آواز کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس سریلی آواز فضا کو خوش گوار بناتی ہے زیادہ تر یہ پرندہ رات کو نغمہ سرائی کرتا ہے اس لیے اس کو انگریزی زبان میں Nightingale کہتے ہیں۔ نظم میں بچوں کو بلبل سے روشناس کروایا گیا ہے ۔ بلبل سے ایک بچی ننھی کی درخواست کے توسط سے شاعر نے فطرت کے حُسن کو دوبالا کرنے والے پرندے بلبل سے بچوں کو روشناس کروانے کی کوشش کی ہے کہ بلبل باغ کی رونق ہے وہ پھولوں سے محبت کرتی ہے اور اُن کی ہم راز ہے۔ ننھی خواہش کرتی ہے کہ بلبل پاس آکر گانا سنائے۔ اس نغمہ گو اور معصوم پرندے کے بارے میں نظیر فاطمہ نے "پیاری بلبل" کے عنوان سے نظم لکھی۔

پیاری بلبل اڑتی جائے　　پیارے گیت سناتی جائے
گھر بھی ایک بنایا اس نے　　جس کو خوب سجایا اس نے
دور تلک یہ اڑ کر جائے　　دانا دنکا ڈھونڈ کے لائے [۲۳]

اس نظم میں بلبل کے گھونسلا بنانے اور دانہ دنکا چگنے جیسی روزمرہ کی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ خوش الحان پرندہ محبت سے اپنا گھونسلا بناتا ہے۔ بچوں میں فطرت کو سمجھنے اور دنیا میں بسنے والی مختلف انواع کی مخلوق کے بارے میں جاننے کا شوق اس طرح کی نظموں کے ذریعے اجاگر کیا جاتا ہے۔ بلبل کا گھونسلا تیار کرنا، دن بھر اڑ اڑ کر دانہ چگنا اور دیگر سرگرمیوں کا بیان بچوں کی فطرت میں دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ بلبل سے بچوں کو آزادی، نرمی، محبت اور فطرت کا درس ملتا ہے۔ بلبل کی موجودگی ماحولیاتی صحت کا اشارہ سمجھی جاتی ہے کیوں کہ یہ پرندہ جنگلات، باغات اور پھولوں میں بسیرا کرتا ہے۔

اگر پرندوں میں دیکھا جائے تو شعرا نے بلبل کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ بلبل بے حد حُسن پرست اور فطرت کی دلدادہ ہے یہ ہی وجہ ہے کہ پھولوں سے محبت صرف شاعروں کا تخیل نہیں ہے بلکہ بلبل کی فطرت میں پھولوں کے سنگ رہنا ہے۔ پھول اور بلبل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ پھولوں ور بلبلوں کے شہر کی بات کی جائے تو فوراً سعدی شیرازی کے شہر شہراز (ایران کا شہر) کا ذکر آتا ہے۔ وہاں باغات اور پھول کثرت سے ہیں اور بلبلوں کا مسکن بھی شہراز ہی ہے۔ مولانا رومی اور حافظ شیرازی نے اسے صوفیانہ استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بلبل کو بہار کی آمد کی علامت سمجھا جاتا ہے یہ خزاں کے موسم میں اداس ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ خزاں آتی ہے تو پھول مرجھا جاتے ہیں۔ ایک صوفی شاعر میاں محمد بخش نے شباب اور حُسن کے ایک وقت کے بعد کھو جانے نیز خزاں اور اس کے نتیجے میں بلبل کے گیتوں کے ناپید ہو جانے کی مماثلت کو اپنے پنجابی کے اشعار میں بہت خوب صورتی اور درد بھرے انداز میں بیان کیا ہے۔

سدا نہ باغیں بُلبل بولے سدا نہ موج بہاراں
سدا نہ ماپے حُسن جوانی سدا نہ صحبت یاراں [۲۴]

کہ ہمیشہ بہاریں نہیں رہتی باغوں میں پت جھڑ کا موسم بھی آتا ہے ایسے میں باغ میں بلبل کے گیت سنائی نہیں دیتے نہ حُسن اور جوانی اا اور نہ ہی دوستوں کی محفلیں باقی رہتی ہیں اور نہ ہی انمول رشتے باقی رہتے ہیں۔

طوطا فطرت کے خوبصورت رنگوں کے امتزاج سے مزّین ایک ذین پرندہ ہے۔ وسیلہ امید نے نظم "میاں میٹھو" میں بچوں کو پاکستان میں پائے جانے والے سبز طوطوں کے متعلق آگاہی دی ہے۔ اُس نے ایک طوطا پالا۔ جب وہ بڑا ہوا تو

سب بہت خوش ہوئے۔ طوطے کی آواز بہت پیاری تھی شاعرہ طوطے سے رازونیاز کرتی۔گھر میں اُس کی وجہ سے رونق تھی وہ سارادن شور مچاتا اور روٹی کی چُوری کھا کر سو جاتا۔

میاں مٹھو بڑا ہوا ہے ہر کوئی گھر میں خوش ہوا ہے
پیاری سی آواز تھی اس کی میں بھی تو ہم راز تھی اس کی
سارادن وہ شور مچائے چوری کھائے اور سو جائے[۲۵]

طوطا ایک ذہین اور انسان سے مانوس ہونے والا پرندہ ہے اگر گھروں میں ایسے مناسب مسکن مل جائے تو یہ وہیں بسیرا کر لیتا ہے۔ جنوبی ایشیا ور مشرق وسطی میں سرخ ہالے والے طوطے پائے جاتے ہیں جو سبز رنگ کے ہوتے ہیں۔ان میں کچھ بولنے والے طوطے بھی ہوتے ہیں انگریزی میں ان کو Ring.Necked Parrot کہتے ہیں۔ جنوبی امریکہ میں بڑی جسامت والے پرندے جو شوخ رنگوں سے مزّین ہوتے ہیں جو مکاؤ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔اس طرح اسٹریلیا،نیوزی لینڈ اور انڈونیشیا میں کوکاٹو نامی طوطے اپنے سفید یا ہلکے رنگ کے ساتھ سر پر تاج سجائے فطرت کے حُسن میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔اسٹریلیا میں لوری کیٹ رنگ برنگے طوطے جو پھولوں کا رس پینا پسند کرتے ہیں فطرت پسندوں کے لیے بہت دیدہ زیب ہیں۔

طوطے بیجوں کے پھیلاؤ کے ذریعے پودوں اور درختوں کا افزائش کا باعث بنتے ہیں۔یہ مختلف کیڑے کھاتے ہیں اور خود انھیں شکاری پرندے لقمہ بناتے ہیں یہ Food Chain یعنی سلسلہ غذا ماحولیاتی توازن کا سبب بنتا ہے۔طوطوں کہ موجودگی سے پتہ چلتا ہے کہ فضا آلودہ نہیں ہے اور پانی شفاف ہے یعنی یہ پرندہ ماحولیاتی اشاروں کے سلسلوں میں بہت اہم ہے۔ان طوطوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔طوطے کی ایک قسم Spix's Macaw برازیل کے خشک جنگلوں میں پایا جاتا ہے اس کی نسل معدومی کے خطرے سے دوچار ہے جس کی وجہ فطرت میں انسانی مداخت اور جنگلات کی کٹائی ہے۔

طوطا بلاشبہ بے حد خوب صورت پرندہ ہے۔مگر ادب میں خود غرض آنکھیں پھیر لینے والے انسان کو طوطا چشم کہا جاتا ہے مگر طوطے کا قصور فقط اتنا ہے کہ وہ ذرا آنکھیں گھماتا ہے۔یہ پرندہ انسان کو فطرت کی دلکشی،رنگینی اور تنوع کا سبق دیتا ہے۔قیوم نظر نے اپنی نظم "کبوتر" میں اس کے انداز اور آواز کے ذریعے بچوں میں دل چسپی پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔

]

غوں غوں غٹر غوں کرتے ہیں میرے سارے کبوتر

گردن اٹھا کے، دم کو پھلا کے پنکھا بنا کے جب ہیں یہ چلتے
لگتے ہیں کتنے پیارے کبوتر[۲۶]

غوں غوں غٹر غوں یعنی میں خوش ہوں، مطمن ہوں اور خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ محی الدین نواب اور سید ضمیر جعفری نے اپنی تحریوں میں کبوتر کی آواز کے الفاظ کو لکھتے رہے ہیں۔ماہرینِ پرندات کبوتر کی آواز کو cooing کہتے ہیں۔اُردو زبان میں اُردو لغت بورڈ، فیروز اللغات اور نور اللغات میں بھی غوں غوں غٹر غوں آواز کی نقل کے طور پر موجود ہے۔بچے فطرتی طور پر آوازوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ قیوم نظر نے بچوں کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کبوتر کی آواز سے نظم شروع کی۔ کبوتر کے چلنے کا انداز بہت پر کشش ہوتا ہے۔ کبوتر ایک پر امن پرندہ ہے جس کو درویش پرندہ کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ اکثر مسجدوں اور مزاروں میں رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا پرندہ ہے جس کا انسان سے تعلق بہت قدیم ہے۔اس نے صدیوں تک انسان کے لیے قاصد کا کام کیا۔ آج بھی کبوتر گھروں میں پالے جاتے ہیں اور کبوتر بازی کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔اس نظم میں بچوں کو کبوتر کی چال ڈھال اور دلکش انداز کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ماحولیاتی نظام میں بھی کبوتر کا اہم کردار ہے۔ کبوتر جب دانہ چگتے ہیں تو مختلف جگہوں پر بیج گرتے ہیں جس کے سبب شجر کاری میں قدرتی مدد ملتی ہے۔ان نظموں کے ذریعے بچوں کو پرندوں سے محبت، ہوا، پانی، خوراک اور ماحول کی اہمیت کا شعور اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

کوّے کے حوالے سے رسالے میں قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری اور شاعر سلطان کھاروی کی نظم شامل کی گئی ہے۔ فطرت کے اس ہوشیار پرندے سے متعلق شاعر کہتا ہے کہ:

آگے پیچھے دائیں بائیں کائیں کائیں کائیں کائیں
صبح سویرے نور کے تڑکے منہ دھو دھا کر ننھے لڑکے
بیٹھتے ہیں جب کھانا کھانے کوّے لگتے ہیں منڈلانے
لاکھ ہنکاؤ، لاکھ اڑاؤ منہ سے چیخو ہاتھ ہلاؤ
ہر دم کھانے کی ہے عادت شور مچانے کی ہے عادت[۲۷]

کالا رنگ اور کالے دھندے لوٹ مار کے سارے پھندے
سارے مل کر خوب لگائیں کوّے تیری کائیں کائیں[۲۸]

پاکستان کا سیاہ رنگ کا یہ پرندہ اپنی مخصوص آواز، شور، کچھ خوبیوں اور خامیوں کی وجہ سے شعرا اور نثر نگاروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے میں کامیاب رہا۔ بدنام ہوئے ہیں تو کیا نام نہ ہو گا۔ کوّے کی یاداشت اور مشاہداتی رویہ اسے فطرت کا ماحولیاتی نگران بناتا ہے۔ ہر دو شعرا نے فطرت بطورِ استاد کے حوالے سے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ کوّا گھنے درختوں پر رہتا ہے۔ صبح ہوتے ہی کائیں کائیں کرتا، گھروں کی منڈیروں پر بیٹھ جاتا ہے۔ اسے دھواں دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس گھر میں کچھ پک رہا ہے۔ اس کے کالے رنگ سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ بھی فطرت کا حُسن ہے اگر مسئلہ کالے رنگ کا ہوتا تو بلبل، کوئل، اور کالا کبوتر کوے کی طرح بدنام ہوتے لہذا کوا اپنے کالے کرتوتوں کی وجہ سے بدنام ہے نہ کہ اپنے رنگ کی وجہ سے۔ کوّا غیر ضروری شور کرتا ہے۔ اس میں سکون اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔ جلد باز ہے۔ کچھ تو کوّا واقعی لالچی ہوتا ہے اور ایک مشہورِ زمانہ کہانی لالچ بری بلا ہے نے کوّے کو بہت بدنام کیا ہے۔ یہ بہت ڈھیٹ ہوتا ہے انسان جتنا شور کر کے ہاتھ کے اشارے کرتا رہے وقتی طور پر اُڑ کر پھر آجاتا ہے۔ اپنے سے کمزور پرندوں کی خوراک چھین لیتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو بہت تنگ کرتا ہے۔ لہذا اپنی نظموں میں شعرا نے بچوں میں شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو جلد باز اور لالچی نہیں ہونا چاہیے۔ انسان کو عزت اور وقار کا خیال رکھنا چاہیے تاہم کوے میں کچھ خوبیاں بھی ہیں جس سے سیکھنا چاہیے مثلاً کوّوں کا آپس میں بہت اتحاد ہوتا ہے ایک کوّے کو پکڑ لیں تو اُس کوّے کے شور پر بیسوں کوّے جمع ہو جاتے گے یہ ایک دوسرے سی باخبر رہتے ہیں ایک کوّے کو روٹی کا ٹکڑا ڈالیں گے تو کائیں کائیں کر کے دوسرے ساتھیوں کو بلائے گا کہ اس گھر میں کھانا دستیاب ہے ہاں البتہ اپنے حصے کا کھانا خود کھائے گا۔ کوّوں میں کوئی صوبائیت، فرقہ واریت اور لسانیت نہیں پائی جاتی ہے جو کہ ایک لعنت ہے۔ اس طرح انسان کے شور کرنے یا ہاتھ ہلانے سے یہ اُڑ کر کہیں نہیں جاتے مگر بندوق اور غلیل کو دیکھ کر اُڑ جاتے ہیں یہ اصل دشمن کی شناخت رکھتے ہیں۔ ماحولیاتی تبدیلیوں کے سبب انسان کے ساتھ پرندے بھی متاثر ہو رہے ہیں پرندوں کی کچھ اقسام معدومیت کے خطرے سے دوچار ہیں۔ کوّا ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے یہ گوشت خور پرندہ مردہ جانوروں، کچرے اور فضلے کو کھا کر ماحول سے آلودگی کو پاک رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ماحول میں اس موجودگی حیاتیاتی صحت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ جنگلات کی کٹائی اور موسمیاتی تبدیلی کے سبب کوّے معدومیت کا شکار ہیں جو ماحولیاتی خطرات کی پیشگی کی علامت ہے۔

رسالہ سہ ماہی ادبیات اطفال میں چند ایک جانوروں کے حوالے سے بھی مختلف شعرائے کرام کی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک نظم اونٹ کے بارے میں ہے جو شاعر ضیاء الحسن ضیاء نے لکھی ہے۔

اونٹ کی شکل بھولی بھالی ہے چال لیکن بڑی نرالی ہے

لمبی گردن ہے لمبی ٹانگیں ہیں　　خوبصورت سی اس کی آنکھیں ہیں
بوجھ کچھ بھی ہو یہ نہیں تھکتا　　پیاس کا بھی یہ غم نہیں رکھتا
ریت کا یہ جہاز کہلائے　　ریت میں دوڑتا چلا جائے[۲۹]

شاعر نے بہت سادہ انداز میں اونٹ کی تصویر کشی ہے۔ یہ ایک گہرے بھورے رنگ کا جانور ہے جو افریقہ، عرب ممالک اور بر صغیر کے صحرائی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اونٹ ایک حلال جانور ہے اور صحرا میں رہنے والے نہ صرف اس کو سواری کے لیے استعمال کرتے ہیں بلکہ اس کے گوشت اور دودھ سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اونٹ صحراؤں میں رہنے والے لوگوں کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کا ایک اہم جزو ہے۔ انسان اور اونٹ کا تعلق صدیوں پرانا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں اونٹ کی خصوصیات اور اس کے خدوخال کا ذکر کیا ہے۔ اونٹ کی لمبی گردن، لمبی ٹانگیں، بھولی بھالی سی صورت اور پیٹھ پر کوہان ہوتی ہے۔ اونٹ کے پاؤں کی ساخت ایسی ہے کہ یہ صحرا کی بھربھری ریتلی مٹی میں تیز چل سکتا ہے۔ اس نظم میں بچوں کو یہ شعور دیا گیا ہے کہ قدرت کا نظام ایسا ہے کہ جو مخلوق جس علاقے میں رہتی ہے اسے اس جگہ کے موسم اور جغرافیائی صورت حال کے مطابق تخلیق کیا گیا ہے۔ اونٹ کو بھی قدرت نے وہ سب خصوصیات عطا کی ہیں جو صحرا میں رہنے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ فطرت اپنے ہر قدم کو ایک خاص نظام کے دائرے میں رہ کر اٹھاتی ہے۔ یہ ریگستانی ماحولیاتی نظام کا اہم جز ہیں یہ مشکل حالات میں بھی ماحولیاتی توازن برقرار رکھتے ہیں۔ اس کا فضلہ زمین کے لیے قدرتی کھاد مہیا کرتا ہے۔ انسانی سرگرمیوں اور ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے سخت ماحول میں رہنے والے اس جانور کو ماحولیاتی خطرات نے دوچار کر دیا ہے۔ قحط، پانی کے ذخائر میں کمی، صحرائی گھاس کی کمی اور شدید گرمی کے سبب اونٹ کی صحت اور افزائشِ نسل پر اثر پڑ رہا ہے۔ پلاسٹک کی آلودگی بھی ان کو متاثر کر رہی ہے۔ کارخانوں اور سڑکوں کی تعمیر کی وجہ سے ان کے روایتی راستے اور چراگائیں ختم ہو رہی ہیں۔ اس ماحول دوست جانور کے لیے چراگاہوں کا تحفظ، ان کے طبعی مراکز قائم کرنا، پانی کے ذخائر میں اضافہ، پلاسٹک بنانے والی فیکٹریوں پر پابندی لگانا جیسے اقدامات کرنا بہت ضروری ہے۔

ایک بلی، موہنی تھا اس کا نام　　اس نے میرے گھر کیا آکر قیام
میں نہ ہوں تو راہ دیکھے کچھ نہ کھائے　　جان پاوے سن میری آواز پائے
بلیلاں ہوتی ہیں اچھی ہر کہیں　　یہ تماشا سا ہے بلی تو نہیں[۳۰]

بلی ایک ایسا معصوم اور شرارتی جانور ہے جو اپنی خوب صورتی اور معصوم شرارتوں کی وجہ سے انسانوں کو بہت پسند ہے۔ بلی کو لوگ گھروں میں پالتے ہیں اور خصوصاً بچے اس سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بلی انسان سے بہت مانوس

ہوتی ہے۔ وہ انسان کے ساتھ رہتی، کھاتی اور اس کے ساتھ بستر میں دبک کر سو جاتی ہے۔ انسان نے بلیوں کے کئی خوب صورت نام بھی رکھے ہوتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے موہنی نام کی ایک بلی کا ذکر کیا ہے جو اس کے ساتھ مانوس ہے۔ بلی رکھنے سے گھر میں ایک رونق ہوتی ہے اور گھر والے اس کی معصوم اداؤں اور شرارتوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ بلیلاں پالنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کے بے حد شوقین ہوتے ہیں اس لیے جدید دور میں انسانوں نے کئی مختلف نسلوں کی بلیلاں مہنگے داموں خرید کر گھروں میں رکھی ہیں۔ جدید دور کے بڑھتے ذہنی دباؤ اور ٹوٹے ہوئے خاندانی نظام کی وجہ سے بھی لوگ گھر میں بلیلاں پالتے ہیں کیوں کہ یہ مصروف اور خوش رہنے کا سبب ہیں۔ یہ ایک ایسا جانور ہے جو فطرتی دنیا اور انسانوں کے مابین موجود ہے۔ بے گھر بلیلاں موسموں کی شدت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان کی بہت بڑی تعداد زہریلہ کھانا کھانے اور ٹریفک حادثات کے باعث ہلاک ہو جاتی ہیں۔ بلیوں سے ہمدردی دراصل فطرت سے ہمدردی ہے۔

طوطا جیسے مرتا ہے　　چوری چوری کرتا ہے
چڑیا شور مچاتی ہے　　گیت صبح کا گاتی ہے
بلی بھی تو بھوکی ہے　　پوچھے روکھی سوکھی ہے
مرغی چوزا کہتے ہیں　　ہم بھی گھر میں رہتے ہیں [۳۱]

اس نظم میں گھروں میں پالے جانے والے مختلف پرندوں اور جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جانور جب بھوکے ہوتے ہیں تو اپنے مالک کو آواز دیتے ہیں۔ اپنی مختلف بولیوں کے ذریعے وہ نہ صرف باور کراتے ہیں کہ ان کو کھانا چاہیے بلکہ جب تک کھانا نہ ملے وہ شور برپا کیے رکھتے ہیں۔ اس میں بچوں کو یہ درس بھی دیا گیا ہے کہ گھر میں جانور پالنا صرف لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ ان کو وقت پر کھانا دینا اور ان کی ضروریات پوری کرنا بھی ضروری ہے۔ اس نظم میں بچوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ پالتو جانور اور پرندے بھی آرام دہ، صاف ستھری اور محفوظ جگہ درکار ہوتی ہے۔ وقت پر کھانا اور پانی مہیا کریں۔ ان پر رحم کرنا اور ان کا تحفظ سب کی ماحولیاتی ذمہ داری ہے۔

موجودہ دور میں جانوروں کے حقوق کی مختلف تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ زمین سب کا مشترکا گھر ہے اس میں سب کو آزاد رہنے کا حق ہے۔ جانوروں اور پرندوں کو قیدی بنانا ظلم ہے کچھ چڑیا گھر جانوروں اور پرندوں کو قیدی بنانے کے ساتھ ساتھ تجارتی مقاصد کی غرض سے اُن کا استحصال بھی کرتے ہیں۔ قدرتی ماحول کی کمی کی وجہ سے جانور اور پرندے بیمار پر جاتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے سفاری پارک موجود ہیں جو ماحول دوست ہیں۔ جہاں ان کی قدرتی

ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قدرتی اور کشادہ ماحول مہیا کیا جاتا ہے۔ بیمار جانوروں اور پرندوں کی باقاعدہ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ نایاب اور معدوم ہونے والے جانوروں اور پرندوں کی نسل کی افزائش کا مراکز ہوتے ہیں۔ ماہرینِ حیاتیات جہاں پر پرندوں اور جانوروں پر تحقیق کرتے ہیں۔ سنگاپور سفاری پارک، چسٹر زو برطانیہ، سنٹر پارک زو نیویارک نہ صرف بچوں کی تفریح کا ذریعہ ہیں بلکہ جانوروں اور پرندوں کے لیے ایک محفوظ مسکن بھی ہیں۔ ضیاء اللہ محسن نے بچوں کی دلچسپی اور جانوروں کے متعلق آگاہی کے سلسلے میں "چڑیا گھر" کے موضوع پر نظم لکھی تاکہ بچے جانوروں کے بارے معلومات حاصل کر سکیں

موٹا سا اک ہاتھی ہے   سب بچوں کا ساتھی ہے
پنکھ اڑائے کر کے شور   دیکھو ناچ رہا ہے مور
بندر ہوتے ہیں نقال   الٹی سیدھی ان کی چال
دیکھو تیتر اور بٹیر   دھوپ میں بیٹھا ہے ایک شیر
کالا سا ہے اک لنگور   شوق سے کھاتا ہے انگور
ہر شے قدرت کی شاہکار   چڑیا گھر کے رنگ ہزار[۳۲]

چڑیا گھر ایک ایسی جگہ ہے جہاں بچوں کو فطرت کے قریب ہونے کا ایک اچھا موقع ملتا ہے۔ خاص طور پر شہری معاشروں میں جہاں قدرتی ماحول میسر نہیں ہوتا، چڑیا گھر بنائے جاتے ہیں تاکہ بچوں کو جانوروں سے متعلق آگاہی حاصل ہو اور وہ لطف اندوز بھی ہو سکیں۔ اس نظم میں ایک چڑیا گھر کی سیر کروائی گئی ہے جس میں ہر طرح کے جانور موجود ہیں۔ شاعر نے مختلف جانوروں کی عادات اور خصوصیات بھی بتائی ہیں۔ مختلف ممالک سے جانوروں کی نسلیں منگوا کر چڑیا گھروں میں رکھی جاتی ہیں۔ اس سے بچوں میں دنیا کے مختلف ممالک میں پائی جانے والی جانوروں کی نسلوں کے بارے میں آگاہی اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

گھوڑا انسان کا بہت قدیم ساتھی ہے۔ بے حد وفادار، بہادر، تیز رفتار، ان تھک اور اپنے سوار کو لے کر میدانوں اور جنگلوں سے دھواں اُڑاتے تیزی سے منزل کی طرف بڑھنے والا، شاہانی انداز سے چلنے والا یہ خوب صورت جانور فطرت کا عظیم مظہر ہے۔ شریف شیوہ کی نظم "اسلم کا گھوڑا" کے چند اشعار تحریر کیے جا رہے ہیں۔

آندھی سی تیزی ہے اس کے چلن میں   بجلی سی پھرتی ہے اس کے بدن میں
چھپا ہے خدا جانے کیا اس کے فن میں   کوئی اس نے میداں نہ جنگل ہے چھوڑا

شاعر نے اس نظم میں بچوں کو گھوڑے کی تیز رفتاری اور مضبوط جسامت کے بارے میں بتایا ہے۔ اس وقت دنیا میں اندازً ساٹھ ملین گھوڑے دنیا کے مختلف ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ جن میں نو ملین سے زائد امریکہ میں، سات ملین چین میں، پانچ ملین برازیل میں اور تقریباً تین ملین ارجنٹائن میں پائے جاتے ہیں۔ عربی نسل گھوڑے خوب صورتی اور قوتِ برداشت کے لیے مشہور ہیں۔ ریس کے لیے تھروبریڈ گھوڑا اپنی شناخت رکھتا ہے۔ کورٹر ہارس سواری اور مورگن گھوڑا گاڑی کھینچنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پونی گھوڑے چھوٹے قد کے ہوتے ہیں اور بچے شوق سے اس پر سواری کرتے ہیں۔ گھڑ سواری، نیزہ بازی اور پولو گھوڑوں پر سوار ہو کر کھیلنے والی مقبول اور دل چسپ کھیل ہیں۔ پاکستان میں مستحکم گھوڑوں کی تعداد تقریباً چار لاکھ ہے۔ یہاں گھوڑوں کا استعمال ثقافتی رنگ دکھانے، زراعت اور کھیل میں کیا جاتا ہے نیز ہماری سیکورٹی فورسز اب بھی گھوڑوں کا استعمال کرتی ہیں۔ ماضی میں ٹانگہ جب ایک پر لطف سواری تھی روالپنڈی شہر میں ٹانگوں کو بہت خوب صورتی سے سجایا جاتا تھا مگر اب اُس کی جگہ رکشہ اور ٹیکسیاں دستیاب ہیں۔ موسمیاتی تبدیلی کی وجہ سے یہ کئی خطرات سے دوچار ہیں مثلاً درجہ حرارت میں اضافہ، قحط، چراگاہوں میں کمی، رہائش اور خوراک جیسے مسائل لاحق ہیں۔ ان کے لیے قدرتی ماحول اور محفوظ چراگائیں ہونی چاہیے اور جانوروں کے حقوق کے قوانین کا نفاذ بہت ضروری ہے۔ جنگلات کی کٹائی، فضائی آلودگی تمام جانداروں کے لیے خطرہ ہے۔

"مچھلی ہوا میں اُڑتی ہے" یہ نظم ضیاء اللہ محسن نے تحریر کی۔ اس نظم میں بے حد دلکش انداز میں بچوں کو پانی کی باسی اس جاندار کو روشناس کروایا ہے۔ یہ نظم ایک پہیلی کی صورت میں ہے جس کے تقریباً بارہ اشعار میں شاعر نے بچوں کی توجہ مبذول کروانے کے لیے مچھلی کا تعارف کچھ اس طرح کروایا کہ مچھلی ہوا میں اُڑتی ہے، پھولوں پر گیت گاتی ہے، شجر پر گھونسلا بناتی ہے، پانی سے ڈرتی ہے اور سارا سارا دن آسمان پر رہ کر زمین پر واپس آجاتی ہے اس کے بعد وہ بچوں سے سوال کرتی ہے کہ

ممکن ہے ایسا بچو!	تم ہی ذرا بتاؤ
مچھلی کو پہلے دیکھو	پھر ذہن بھی لڑاؤ
آؤ تمہیں میں بتلاؤں	دریاؤں کی ہے رانی
یہ تو ہوا سے ڈرتی ہے	مچھلی کا گھر ہے پانی[۳۴]

مچھلی ماحولیاتی نظام میں اہم کردار ادا کرتی ہے یہ دنیا بھر کے دریاؤں، سمندروں، ندیوں، جھیلوں اور تالابوں میں پائی جاتی ہے۔ آبی آلودگی، درجہ حرارت میں اضافہ اور ڈیموں کی تعمیر کی وجہ سے مچھلیوں کو خطرات لاحق ہیں۔ صاف پانی ہر جاندار کی ضرورت ہے ۔ آبی آلودگی پر قابو پانا اور پانی کی صفائی بہت ضروری ہے۔ فطرت کا تحفظ سب کی ذمہ داری ہے۔

نظم "عنصیلی گلہری" از صاعقہ علی نوری یہ سترہ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم ہے۔ بچوں کو گلہری کا تعارف کچھ اس انداز میں کروایا گیا ہے

تھے بڑے بال اور خوب پھولی دُم
اور سمجھدار اتنی کہ حیران ہو تم[۳۵]

شاعرہ کہتی ہے کہ گلہری دیکھنے میں بہت بھلی لگتی ہے درختوں میں رہتی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت چمکدار اور خوب صورت ہوتی ہیں مگر:

اور مزاج اس کے اچھے نہیں تھے ذرا لڑتی جھگڑتی تھی وہ بر ملا
اس کے اخلاق بد کا صلہ یہ ملا جب برا وقت آیا، کوئی نہ ملا[۳۶]

یہ ایک طویل اور سبق آموز نظم ہے جس میں گلہری کی بد اخلاقی اور عنصیلی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے اور اس کا انجام بھی پیش کیا گیا ہے۔ گلہری سب جانوروں سے بد اخلاقی سے پیش آتی تھی اور پھر ایک دن بارش میں گلہری کے آشیانے کو نقصان پہنچا، اب وہ بہت پریشان تھی اور کسی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتی تھی کیوں کہ اس نے سب سے دشمنی مول رکھی تھی۔ سب جانوروں نے جب اس کو پریشان دیکھا تو اس کی مدد کو آئے، یہ دیکھ کر گلہری شرمندہ ہوئی اور بد اخلاقی سے باز آئی اور سب نے گلہری کو معاف کر دیا۔ پھر سب کو اُس نے اخروٹ پیش کیے۔ ان اشعار کے ذریعے شاعرہ بچوں میں شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمیں فطرت سے سیکھنا چاہیے۔ بد اخلاق اور بد مزاج انسان آخر کار تنہا رہ جاتا ہے۔ لہذا ہمیں خوش اخلاق ہونا چاہیے۔ شاعرہ نے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی ساتھی اچھے مزاج کا نہیں ہے تو مشکل وقت میں اسے تنہا نہ چھوڑیں۔ وہ ندامت کے بعد راہِ راست پر آجائے گا مزید یہ کہ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دینا چاہیے فطرت کا یہ ہی سبق ہے۔

سہ ماہی رسالہ ادبیات اطفال میں کچھ نظمیں فطرت نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ کشمیر، مری اور پاکستان کے دیگر محسور کن اور دل کش نظاروں سے متعلق شعرا نے مختلف رنگوں کو اپنے اپنے اشعار میں قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ بچوں کو فطرت اور اپنے وطن سے محبت کے سلسلے میں شعور اور آگاہی کے زیور سے آراستہ کیا جاسکتا ہے

کشمیر کے نظارے خوشبو بھرے ہیں سارے
کیا اس کی آبشاریں کیا خوب تر ہیں جھیلیں
خوشبو بھری ہوائیں مہکی ہوئی فضائیں
اونچے چنار اس کے اور کوہسار اس کے[۳۷]

رمضان گوہر نے اپنی نظم "کشمیر کے نظارے" میں کشمیر کے قدرتی حُسن اور دلکش مناظر کا ذکر کیا ہے۔ یہ وادی ہمالیہ کے دامن میں واقعہ ہے۔ دریائے جہلم، سندھ اور چناب اسی انمول خطے سے جنم لیتے ہیں اور یہاں کے گلیشیرز پورے انڈس بیسن کے پانی کا ذریعہ ہیں۔ سیچن گلیشر دنیا کا دوسرا بڑا گلیشر ہے جس کی لمبائی تقریباً ۷۶ کلو میٹر ہے۔ اس گنت نظیر وادی میں مختلف اقسام کے درخت، نایاب پودے، پرندے، جنگلی حیات، آبشاریں، جھیلیں چنار کے درخت اور پہاڑ وغیرہ پائے جاتے ہیں یہ فطرت کے مظاہر کشمیر کو جنت بناتے ہیں۔ یہاں کالا ریچھ، مارخور، برفانی چیتا، مینگول ہرن جیسے جنگلی جانور موجود ہیں۔ منسر جھیل، نگران جھیل، ڈل جھیل اور دیگر چھوٹی بڑی جھیلیں دل کش مناظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی نظام میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس نظم میں بچوں کو حسین مقامات کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا ہے اور ان کو قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کا شعور دیا گیا ہے۔

یہ ہے مری کی وادی جیسے ہو شاہ زادی
کہسار دل نشیں ہیں نظارے سب حسیں ہیں
پائے وہ ایسی راحت اچھی ہو اس کی صحت
ہو جب کہ برف باری پھر دیکھو فضلِ ربّی
سرسبز پر اثر ہے اور جاذبِ نظر ہے[۳۸]

ان اشعار میں مری کے دلکش اور صحت افزا مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مری ایک بلند و بالا سرسبز علاقہ ہے جہاں سردیوں میں برف باری کے حسین مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس نظم میں بچوں کو قدرت کے حسین مناظر اور صحت افزا ماحول کا شعور دیا گیا ہے۔ آلودگی سے پاک آب و ہوا اور سرسبز علاقے انسان کی اچھی صحت کے لیے بہت اہم

ہوتے ہیں۔ یہاں چیڑ، دیودار، اور دیگر نایاب درختوں پر مشتمل جنگلات موجود ہیں۔ بچوں کو اس نظم کے ذریعے نہ صرف پاکستان کے انمول اور قدرتی حُسن سے بھرپور مقامات کے بارے میں آگاہی دی گئی ہے بلکہ فطرت سے جڑے رہنے اور آلودگی سے پاک ماحول کی اہمیت کا شعور بھی دیا گیا ہے۔

یہ دیس اک چمن ہے اس میں شگفتگی ہے ہر ڈالی اس چمن کی یار وہری بھری ہے
دریا، پہاڑ، وادی، یہ گیت گاتی نہریں یہ آبشار و صحرا، ہر شے میں زندگی ہے
جھومر سجائے کھیتی، بندیا لگائے پربت مٹی کی سوہنی خوشبو، ہر سو بسی ہوئی ہے
شام و سحر کا منظر بے شک ہے کیف آور لیل و نہار میں بھی اک کیف و دلکشی ہے[۳۹]

محمد مشتاق قادری کی نظم "پھول میرا وطن" فطرت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے ملک کے قدرتی حُسن و جمال کی خوب صورت الفاظ میں عکاسی کی ہے۔ پاکستان فطرت کے حُسن کے لحاظ سے جنت نظیر ہے۔ یہ نظم فطرت اور وطن دونوں سے محبت اور شعور کا درس دیتی ہے۔ یہاں چراہ گاہ، بحر و بر، دشت و جبل، جنگلات، گیت گاتے پرندے اور لہلاتے کھیت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فطرت کے یہ مناظر نہ صرف دیکھنے میں پُر لطف لگتے ہیں بلکہ ماحولیاتی توازن کو بھی قائم رکھتے ہیں۔ اس نظم میں بچوں کو اپنے وطن سے محبت اور ماحولیاتی تحفظ کے متعلق آگاہ کیا گیا ہے اور قدرتی نظارے خدا کی نعمت ہیں ان کی حفاظت کرنا ہم سب کا اوّلین فرض ہے۔
اس میں فطرتی مناظر کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تاکہ بچوں میں قدرت کے حُسن سے آگاہی اور اس کی طرف دلچسپی پیدا کی جاسکے۔
کھیت فطرت کا حسین مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی محنت کا امتزاج بھی ہیں کسان دن رات کھیتوں میں ان تھک کام کرتا ہے۔ ضیاء الحسن ضیاء کی نظم "کھیت" میں کھلے آسمان کے نیچے سرسبز کھت، کسان کی انتھک محنت، گندم کے بالوں کا سنہری رنگ، سرسوں کے پھولوں کی زردی، چاول کے کھیتوں میں پانی کی چمک اور چہچہاتے پرندے بچوں کو فطرت سے محبت کا پیغام دیتے ہیں۔

پیارے پیارے کھیت ہیں اپنے دلکش دلکش اچھے اچھے
گیہوں کی ہے شان نرالی دالیں بھی ہیں دیکھنے والی
کھیت ہیں پاکستان کی دولت کیوں نہ کریں ہم ان کی حفاظت
بالیاں خوشبو پھیلاتی ہیں سب کے دلوں کو بہلاتی ہیں
جتنا غلّہ پیدا کریں گے اتنے ہی ہم آگے بڑھیں گے[۴۰]

بلاشبہ لہلاتے کھیتوں کا بھی اپنا فطرتی حُسن ہوتا ہے۔ کپاس کی فصل کے سفید پھول جب کھلتے ہیں تو دور تک سفید چاندنی کی چادر بچھی نظر آتی ہے، گندم کی بالیوں کی سنہری چادر آنکھوں کو خیرا کرتی ہے اور سبز پتون کی آغوش میں سرسوں کے پھیلے پھولوں کا منظر بھی بہت دلکش ہوتا ہے اور ہر فصل کی اپنی اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ اس کی معیشت کا انحصار بڑے پیمانے پر زراعت پر ہے۔ اس نظم میں شاعر نے بچوں کو کھیتی باڑی کی اہمیت سے آگاہ کیا ہے اور فصلیں اور اناج اُگانے کے بارے میں شعور و آگاہی دینے کی سعی کی ہے۔ جدید دور میں جہاں غذائی اشیا ملاوٹ سے بھری ہوئی اور مصنوعی طریقوں سے تیار کی جاتی ہیں وہاں کھیتوں میں قدرتی طریقے سے اُگائی جانے والی فصلوں اور اناج صحت کے لیے بہترین اور ملاوٹ سے پاک ہوتی ہیں۔ بچوں کو ان قدرتی اشیا کے استعمال اور ان کی پیداوار کو فروغ دینے جیسے امور کا شعور دینا لازمی ہے۔ اس نظم میں بچوں میں قدرتی غذائی اشیا اور زراعت کے حوالے سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر دن رات کے مختلف اوقات کی بات کی جائے تو صبح کے وقت پر شعرا نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک تو صبح جلدی اٹھنا صحت مند سرگرمی ہے اور اس وقت فطرت اپنے جوبن پر ہوتی ہے۔ سورج کی پہلی کرن جیسے ہی افق سے جھانکتی ہے تو آسمان پر پھیلتی روشنی کے اس منظر کو دیکھ کر انسان کو سکون میسر آتا ہے۔ چہچہاتے پرندے، ٹھنڈی ہوا، شبنم میں بھیگی گھاس، آلودگی سے پاک فضا کے ساتھ دن کا آغاز انتہائی خوشگوار ہوتا ہے۔

صبح سویرے اٹھتا ہوں　　روز اندھیرے اٹھتا ہوں
پھول اسی دم کھلتے ہیں　　غنچے آنکھیں ملتے ہیں
شبنم بکھری ہوتی ہے　　کلیوں کا منہ دھوتی ہے
باغ معطر ہوتا ہے　　دلکش منظر ہوتا ہے
بلبل گیت سناتی ہے　　کوئل شور مچاتی ہے
جسم میں چستی رہتی ہے　　آنکھ بھی ٹھنڈک پاتی ہے
جو کوئی اس دم سوتا ہے　　اس نعمت کو کھوتا ہے[۴۱]

اس نظم میں شاعر نے صبح سویرے اٹھ کر فطرت سے استفادہ کرنے کی طرف بچوں کی توجہ مبذول کروائی ہے۔ جدید دور میں انسان کا فطرت سے تعلق کم ہوتا نظر آرہا ہے اور لوگ مصنوعی دنیا میں زیادہ مصروف ہیں۔ رات کو قدرت نے آرام کرنے کے لیے بنایا ہے لہٰذا رات کو وقت پر سونا اور صبح سویرے اٹھنا انسان کی صحت پر اچھا اثر ڈالتا

ہے۔ شاعر نے صبح جلدی اٹھنے کی تاکید کرتے ہوئے بچوں میں فطری حُسن کو قریب سے دیکھنے کا شعور بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نظم میں دیر سے اٹھنے کے نقصان بھی بتائے گئے ہیں۔ جو صبح کے وقت سویا رہتا ہے وہ بہت کچھ کھو دیتا ہے۔ صبح پھول کھلنے کا وقت ہے باغ میں ہر طرف خوشبو بکھری ہوتی ہے۔ بلبل اور کوئل گیت گا کر صبح کا پیغام دے رہی ہوتی ہیں۔ شبنم کے قطرے کلیوں کا منہ دھلا رہے ہوتے ہیں۔ اوس کی وجہ سے کلیوں کے رنگ نکھر رہے ہوتے ہیں۔

زمانے سے غائب اندھیرا ہوا　　گئی رات بچو سویرا ہوا
ابھارا ہے مشرق سے سورج نے سر　　کیا ہے شروع اس نے اپنا سفر [۴۲]

امان اللہ نیر کی یہ نظم دس اشعار پر مشتمل ہے انھوں نے صبح کے وقت فطرت کے مسحور کن رنگوں پر خوب صورت اشعار تحریر کیے ہیں۔ صبح کی خاص بات سورج کے طلوح ہونے کا خوب صورت منظر ہے۔ سورج کا طلوع ہونا انسان کو امید، حوصلہ اور نئے جذبے کے ساتھ آگے بڑھنے اور منزل کو پا لینے کی جستجو کا پیغام دیتا ہے۔ اندھیرے سے اجالے کا سفر اس کا مطلب ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ پھر یہ کہ انسان کے لیے صبح کے وقت سورج کی کرنیں قدرتی توانائی کا ذریعہ ہیں۔ صبح امید کی نشانی ہے اور سورج کا طلوع ہونا انسان کو حوصلے اور نئی امید کے ساتھ آگے بڑھنا سکھاتا ہے۔ فطرت انسان کو زندگی کا پیغام دیتی ہے اور انسان اس سے امید پا کر آگے بڑھتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے بچوں کو صبح کی روشنی اور سورج کے طلوع ہونے پر غور و فکر کی دعوت دی ہے اور فطرت کے ان عناصر سے جڑے رہنے کی طرف ان کی توجہ دلائی ہے۔

جدید دور میں انسان کی مصروفیات اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ قدرت کو نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا وقت نکال نہیں پاتا۔ الیکٹرانک میڈیا اور موبائل فون کا استعمال بھی بچوں کو رات دیر تک سونے نہیں دیتا جس کی وجہ سے آنکھوں کی بینائی کمزور ہو رہی ہے صبح کی سیر کا تصور آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے دیر تک جاگنا اور صبح تاخیر سے اٹھنا بے حد غیر صحت مندانہ سرگرمی ہے۔ بچے بڑے فطرت کے خوب صورت نظاروں سے محروم رہ جاتے ہیں فطرت کے قریب رہنا ہی اصل زندگی ہے۔ فطرت سے لطف لینے کا ایک بہترین وقت صبح کا ہے اور صاف ہوا میں سانس لینے سے صحت بھی اچھی ہوتی ہے۔ شاعر نے اس نظم کے ذریعے بچوں میں صبح جلدی اٹھ کر سیر پہ جانے کی نصیحت بھی کی ہے۔

سب کو تھی نیند پیاری　　جاگ رہے تھے باری باری
چڑیا آئی، کوّا آیا　　کوئل نے بھی گیت سنایا

جاناہی تھا، گیا اندھیرا　　دیکھو آیا نیا سویرا
بچو منہ اندھیرے جاگو　　یعنی صبح سویرے جاگو
سمجھو اپنی ذمہ داری　　اسکول کی کرو تیاری[۴۳]

صبح سویرے جاگنے کے حوالے سے اس نظم میں ایک مختلف انداز میں بات کی گئی ہے۔ شاعر نے بچوں کو جلدی اٹھ کر صبح کا خوب صورت وقت دیکھنے کی تلقین فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے کی ہے۔ اس میں ان پرندوں کا ذکر کیا گیا ہے جو صبح سویرے اٹھ کے چہچہانا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان کو فطرت سے سبق لینا چاہیے کہ صبح جلدی اٹھنا فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ اگر انسان فطرت کے قوانین کی پاسداری کرے گا تو صحت کی خرابی سے بچا رہے گا۔ اس نظم میں بچوں کو پرندوں اور دیگر جانوروں یا فطرت سے سبق لینے کا درس دیا گیا ہے نیز بچوں میں فطرت سے لگاؤ پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ ماضی کے ایک رسالے میں سوال و جواب کا صحفہ تھا فلم سٹار شبنم اپنے عروج پر تھی کسی نے پوچھا کہ شبنم کا پتہ بتایئے جواب ملا کہ صبح کے وقت گھاس اور پھولوں میں ملتی ہے۔ صبح کے جلدی اٹھنے کی تاکید کرتے ہوئے کسان اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ:

بیٹا! جو سورج طلوع ہونے سے پہلے جاگتا ہے وہ بھوک، محرومی، تکلیف اور ناکامی سے پہلے جیت جاتا ہے ۔

دیکھو ہوا سویرا　　لو چھٹ گیا اندھیرا
سورج نے آنکھ کھولی　　ٹہنی پہ چڑیا بولی[۴۴]

صبح جلدی اٹھنے کا شعور اجاگر کرنے کی کوششوں میں اس نظم کا بھی اہم کردار ہے۔ بچوں میں چڑیا کی بولی اور سورج کی کرنوں کے ذکر کے ذریعے صبح جلدی اٹھنے کے حوالے سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جدید دور میں اس طرح کی نظموں کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے کیوں کہ اس مصنوعی دور میں جہاں بچے فطرت سے دور ہوتے جا رہے ہیں وہاں ایسی نظمیں بچوں کو فطرت سے جڑے رہنے اور قوانین فطرت کی پاسداری کرنے کے حوالے سے شعور و آگاہی فراہم کرتی ہیں۔

سہ ماہی ادبیات اطفال میں موسم کے موضوع پر لکھی گئی کچھ نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں جن میں پاکستان کے موسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پاکستان ایک ایسا خطہ ہے جہاں ہر موسم دیکھنے کو ملتا ہے۔ سخت سردی، سخت گرمی، دلکش بہاریں، خزاں اور بارشوں کے موسم سبھی پاکستان میں پورا سال آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ اس خطے کی جغرافیائی ساخت ہے۔ یہاں سنگلاخ پہاڑ، زرخیز میدان، گھنے جنگلات، گرم صحرائی علاقے اور برفانی علاقے سب

پائے جاتے ہیں۔ پاکستان کے موسم فطرت کا ایک عظیم مظہر ہیں۔ کئی شعرا نے ان موسموں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔

بچوں کو گرمیوں کی چھٹیاں ہو جاتی ہیں۔ عموماً بچے شدید گرمی میں کھیلنے کودنے سے باز نہیں آتے جس کے سبب ہیٹ اسٹروک، اور اسہال جیسی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فطرت کے اس جبر سے آگاہی اور بچوں کو اس موسم کی حدت سے محفوظ رکھنے کے لیے نظم "گرمی" ملاحظہ ہو۔

اف یہ گرمی اور پسینا　　مشکل میں ہے سب کا جینا
کیسے نکلیں گھر سے باہر　　لے لیتے ہیں چھتری سر پر
جب بھی نکلو گھر سے باہر　　لے لو کوئی کپڑا سر پر
دن کو تم باہر نہ جاؤ　　شام کو جا کر سودا لاؤ[۴۵]

اس نظم میں شاعر نے شدید گرمی کے موسم کو موضوع بنایا ہے۔ گرم میدانی اور صحرائی علاقوں میں گرمی کا موسم بہت گرم ہوتا ہے۔ جدید دور میں ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ فطری ماحول کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے زمین کا درجہ حرارت بڑھتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے گرم علاقوں میں گرمی کا موسم اور بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ہیٹ اسٹراک جیسے مسائل تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ بچوں کو اس نظم میں گرمی سے بچنے کی کچھ تدابیر بتائی گئی ہیں جن میں دوپہر کو گھر سے نہ نکلنا، اگر نکلنا پڑے تو چھتری یا سر پر کپڑا رکھنا تاکہ سورج کی تیز شعاؤں سے بچا جا سکے اور سودا سلف لانے شام کو جانا جیسی احتیاطی تدابیر شامل ہیں۔ اس نظم میں بچوں کو موسم کی شدت سے بچنے کے حوالے سے شعور و آگاہی فراہم کی گئی ہے

چیلیں انڈے چھوڑ رہی ہیں　　گرمی سے دم توڑ رہی ہیں
پیاس کے مارے ہیں بے حال　　حلق میں کانٹوں کا ہے جال[۴۶]

حوت میں آفتاب آیا ہے　　مرغ و ماہی کے تئیں جلایا ہے
خشک و تر سب نہال جلتے ہیں　　کفِ افسوس پتے ملتے ہیں[۴۷]

برطانیہ کا مشہور فطرت پسند شاعر کولرج فطرت کو روحانی استاد کے طور پر دیکھتا ہے۔ فطرت سے نرمی، ہمدردی اور سچائی کی تربیت ملتی ہے مگر فطرت انسان کو رحمت کے ساتھ زحمت اور سزا بھی دے سکتی ہے۔ کولرج نے فطرت کے غضب کو مدنظر رکھا ہے۔ ناصر زیدی اور غلام ہمدانی مصحفی نے متذکرہ بالا اشعار میں شدید گرمی اور فطرت کے

غضب کا ذکر کیا ہے۔ شدید گرمی سے پرندے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ چیل انڈوں پر بیٹھنا ترک کر دیتی ہے اور گرمی سے ہلاک ہو جاتی ہے۔ پیڑ پودے بھی مرجھا جاتے ہیں۔ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے موسم کی حدت میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ ان نظموں میں بچوں کو گرمی کی شدت سے انسان اور دیگر حیوانات پر مرتب ہونے والے مضر اثرات سے آگاہ کیا گیا ہے اور زمین کے درجہ حرارت میں اضافے کے خطرناک اثرات کا شعور دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

پھیلے پھیلے بکھرے بکھرے لیٹے لیٹے جنگل ہیں　　گہرے گہرے بکھرے بکھرے سوئے سوئے سائے ہیں
آدھے آدھے پورے پورے تیکھے تیکھے کانٹے ہیں　　تپتے تپتے سہمے سہمے دبکے دبکے ذرّے ہیں
نکسے نکسے نکھرے نکھرے مہکے مہکے غنچے ہیں　　بھینی بھینی میٹھی میٹھی اڑتی اڑتی خوشبو ہے[۴۸]

جنگل ایک ایسا مقام ہے جہاں فطرت کے سبھی رنگ ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے جنگل کے قدرتی حُسن اور فطرت کے سبھی رنگوں کے یکجا ہونے کی بات کی ہے۔ جنگلات فطرت کا ایک ایسا اہم عنصر ہیں جہاں کئی اقسام کے نباتات اور حیوانات کی افزائش ہوتی ہے۔ جنگل زمین پر بہت سی مخلوقات کا گھر ہے۔ اس کے علاوہ زمین پر موسمیاتی تبدیلیوں میں بھی جنگلات کا بڑا عمل دخل ہے۔ میراجی نے جنگل میں موجود فطرت کے مختلف مظاہر کو ایک خاص آہنگ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری میں جنگل کی سیر کرنے کی دلچسپی اور خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جنگلات کا کٹاؤ آج کے دور میں فطرت کے سب سے بڑے نقصانات میں سے ایک ہے۔ جنگل کی اہمیت اور اس کی قدرتی خوب صورتی کا شعور اجاگر کرنا ایک ضروری امر ہے۔ اس نظم میں جنگل کے حُسن کو اس خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ جس سے بچوں کے ذہن میں جنگلات کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور ان میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ جنگل فطرت کا ایک اہم ترین مظہر ہے اور اس میں ایک بیش قیمت فطرتی دولت موجود ہے جس کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔

شاعر میران جی نے بچوں پر زور دیا ہے اور اُن کی توجہ جنگل کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی کی ہے کہ کبھی اتوار کسی جنگل میں منا کر دیکھیں۔ جنگل میں بڑے بڑے درخت کہیں جھنڈ کی صورت آپس میں سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے ہوں گئے کبھی مختلف فاصلوں پر اکیلے اکیلے ملیں گئے۔ ان درختوں کے سائے بھلے معلوم ہوتے ہیں گھنے درختوں کے سائے گہرے ٹھنڈے اور مہربان ہوتے ہیں رُکے رُکے اور خاموش ہوتے ہیں جیسے سو رہے ہوں۔ شاعرہ نے بچوں کو شعور اور آگاہی دی کہ جنگل میں جگہ جگہ شفاف پانی کے چھوٹے چھوٹے چشمے ہوتے ہیں اور

درختوں کے درمیان چھوٹے بڑے مختلف بھورے رنگ کے راستے جنھیں پک ڈنڈیاں کہتے ہیں بل کھاتے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔ کہیں درختوں کی جھکی جھکی شاخیں روک لیتی ہیں کہ بھائی صاحب کہاں جارہے ہو؟ کہیں کانٹے اپنی موجودگی کا احساس دلارہے ہوتے ہیں۔ مختلف حشرات انسانوں کو دیکھتے ہیں چل پرتے ہیں رک جاتے ہیں پھر دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں میراں جی بطورِ خاص گرگٹ کا ذکر کرتی ہیں جو اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھا کر دیکھتے ہیں پھر سر چھپالیتے ہیں اور معتدد بار سر اٹھاتے ہیں، دیکھتے ہیں پھر سر چھپالیتے ہیں۔ ان کی سرگرمی بہت دل چسپ ہوتی ہے۔ جنگل میں طوطے اور رنگ برنگے پرندے گنگنارہے ہوتے ہیں اور فطرت کی خوبصورتی میں اپنے حصے کے رنگ بھر رہے ہوتے ہیں۔ جنگل کے بیچوں بیچ ندیا بہتی ہے۔ ندیا کے کنارے اُگنے والے پودے خُوب پیاس بجھاتے ہیں اور ان کی شاخیں سر سبر اور گھنی ہوتی ہیں۔ جنگل میں اُگے ہوئے پھول جگہ جگہ مسکرارہے ہوتے ہیں۔ درختوں، غنچوں اور پھولوں کی خوشبو جنگل کے ماحول کو بے حد خوشگوار اور معطر بنادیتی ہے۔ بلاشبہ جنگل میں فطرت کی خوب صورتی کے مختلف مظاہر کا ایک البم ہے۔ لیکن لوگ اس طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نے کیاخوب کہاہے کہ جنگل کا پھول، غریب کی جوانی اور سردیوں کی چاندنی یوں ہی بیکار جاتے ہیں۔ اس نظم میں میراں جی جنگل کے فطرتی حُسن اور فطرت کے سبھی رنگوں کے یکجا ہونے کی بات کی ہے۔ جنگلات میں جانور اور پرندے محفوظ رہتے ہیں۔

آؤ بچو پیڑ لگائیں　　اپنے ملک کا حُسن بڑھائیں
تازہ ہوا فراہم کرنا　　سب سے اچھا کام ہے ان کا
بارش یہ برساتے ہیں　　موسم صاف بناتے ہیں
ان کے فوائد گنواؤں　　ڈر ہے کہیں بھول نہ جاؤں[۴۹]

خانزادہ سمیع الوریٰ کی یہ نظم درخت لگانے کی اہمیت کا شعور اجاگر کرنے کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔ اس میں شاعر نے بچوں کو درخت لگانے کی اہمیت سے آگاہ کیاہے۔ درختوں کے کئی فوائد ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہ آکسیجن پیدا کرتے ہیں جو انسانوں اور جانوروں کے سانس لینے کا ذریعہ ہے۔ یہ زمین کی ہوا کو صاف کرتے ہیں اور فضائی آلودگی کو قابو میں رکھتے ہیں۔ ان سے پھل اور لکڑی وغیرہ بھی حاصل کی جاتی ہے جو مختلف صورتوں میں انسانوں اور دیگر مخلوقات کے کام آتی ہے۔ درخت بہت سے پرندوں اور دیگر حیوانات کا مسکن ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کا موسم بڑے پیمانے پر درختوں پر منحصر ہے۔ یہ بارشوں کا سبب بنتے ہیں اور قحط سالی سے بچاتے ہیں۔ یہ آندھی، طوفان اور سیلاب جیسی آفتوں سے بچانے کا سبب بنتے ہیں اور ان سے دنیا کا رنگوں سے بھرپور قدرتی حُسن بھی قائم

رہتا ہے۔ درختوں کے فوائد اتنے زیادہ ہیں کہ انھیں شمار کرنا مشکل ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین کا یہی کہنا ہے کہ جنگلات کی کٹائی، درختوں کی حفاظت اور افزائش کے متعلق عدم توجہی کی وجہ سے موسمیاتی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور موسمیاتی حدت اور فضائی آلودگی جیسے گھمبیر مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سکولوں میں شجر کاری کا دن منایا جاتا ہے مگر بعد میں آبیاری اور حفاظت کی زحمت کم ہی کی جاتی ہے۔ اسی طرح شاہراہوں کی تعمیر اور شہری آبادیوں کی توسیع کے لیے درخت کاٹے جاتے ہیں مگر اس کے بدلے میں مزید درخت نہیں لگائے جاتے۔ زمین کو انسانوں کے رہنے لائق بنانے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر شجر کاری کی جائے۔ درخت لگانے اور ان کی حفاظت کرنے کا شعور اجاگر کرنا اس دور کے اہم ترین امور میں سے ایک ہے۔ شاعر نے اس نظم میں بچوں کی شجر کاری کی طرف نہ صرف توجہ مبذول کرائی ہے بلکہ ان کو یہ شعور و آگہی بھی فراہم کی ہے کہ درخت لگانا اور ان کی حفاظت کرنا انسانی زندگی کی بقا کے لیے بہت اہم ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ادریس بابر ،"تتلی" اور لڑکی مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد ،ش۲(جولائی تا ستمبر۲۰۱۷ء)،ص۲۵۔

۲۔سلطان کھاروی،"تتلی"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد،ش۷(اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۸ء)،ص۱۶۔

۳۔الطاف حسین،"تتلی"مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۱۰(جولائی تا ستمبر۲۰۱۹ء)،۳۲۔

۴۔ریاض حسین قمر ،"تتلی"ی مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد ،ش۲۱ (اپریل تا جون۲۰۲۲ء)،س۳۷۔

۵۔فریدہ گوہر،"تتلی"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد،ش۲۱(اپریل تاجون۲۰۲۱ء)،ص۱۱۲۔

۶۔جان کاشمیری ،"جگنو" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد ،ش۷(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء)،ص۱۷۔۷۔

۷۔ علامہ اقبال،"جگنو" https://www.rekhta.org/nazms/jugnuu-allama-iqbal-nazms-279?lang=ur ریختہ لغت،۱۴جولائی بتاریخ۲۰۲۴ء،بوقت۵:۵۵۔

۸۔افق دہلوی،"سورج"مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۲۶(جولائی تا ستمبر۲۰۱۸ء)۔ص۲۶۔

۹۔غنی دہلوعی،"چاند"مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۲۱(اپریل تاجون۲۰۲۲ء)،ص۱۱۰۔

۱۰۔سلطان کھاروی،"دور فلک پر بستے ستارے"مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۴(جنوری تا مارچ)،ص۲۸۔

۱۱۔مجید امجد،"تارے"مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۲۱(اپریل تاجون۲۰۲۲ء)،ص۱۲۱۔

۱۲۔https://www.urduweb.org/mehfil ۔اُردو محفل،بتاریخ۲۵جولائی۲۰۲۴ء،بوقت۳:۴۴۔

۱۳۔آغا شیدا کشمیری ،"یہ دنیا "مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد ،ش۲۱(اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص۲۶۔

۱۴۔ضیاءالحسن ضیاء"دریا"مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۵(اپریل تاجون۲۰۱۸ء)،ص۳۹۔

۱۵۔ظہیر کاشمیری،"ندیا بہتی جائے" مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد ،ش۱۲(اکتوبر تا مارچ۲۰۱۹ء)،ص۲۴۔

۱۶۔عمران کمال،"دیکھو بچوں بہتا پانی" مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۲۱(اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص۱۰۶۔
۱۷۔افق دہلوی،"سمندر"مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۲(جولائی تا ستمبر۲۰۱۸ء)،ص۲۱،
۱۸۔احمد ندیم قاسمی ،"بادل کا گیت "مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد ،ش۶(جولائی تا ستمبر ۲۰۱۸ء)،ص۲۲۔
۱۹۔ایضاً،ص۲۲۔
۲۰۔ارسلان اللہ خان،"بارش آئی"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۱۴(جولائی تا ستمبر۲۰۲۰ء)،ص۹۲۔
۲۱۔الطاف حسین،"ساون آیا "مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد ،ش۵(اپریل تا جون۲۰۱۸ء)،ص۴۳۔
۲۲۔ضیاء الحسن ضیاء،"فاختہ"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد،ش۵(اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۸ء) ،ص۱۴۔
۲۳۔چراغ حسن حسرت ،"ننھی اور بلبل" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد،ش۵(اپریل تا جون ۲۰۱۸ء)،ص۳۵۔
۲۴۔ نظیر فاطمہ ،"پیاری بلبل" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد ،ش۲۲(جولائی تا ستمبر۲۰۲۲ء)،ص۴۴۔
۲۵۔https://www.urduweb.org/mehfil ۔اُردو محفل،بتاریخ۱۴اگست ۲۰۲۴ء۔
۲۶۔وسیلہ امید،"میاں میٹھو"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد،ش۲۴(جنوری تا مارچ۲۰۲۳ء) ،ص۲۸۔
۲۷۔قیوم نظر،"کبوتر"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۵(اکتوبر تا مارچ۲۰۲۰ء)،ص۱۶۔
۲۸۔حفیظ جالندھری،"کوّا"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۳(اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۷ء)،ص۱۹۔
۲۹۔سلطان کھاروی،"کوّے تیری کائیں کائیں"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۵(اپریل تا جون ۲۰۱۸ء)،ص۴۰۔

۳۰۔https://www.rekhta.org/ ،ریختہ لغت،بتاریخ۲۳اگست ۲۰۲۴،بوقت ۱۰:۳۴۔
۳۱۔ ضیاءالحسن ضیاء ،"اونٹ "مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۳ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء)،ص۲۴۔
۳۲۔میر تقی میر ،"موہنی بلی" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۳ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء)،ص۱۸۔
۳۳۔سلطان کھاروی، "جانوروں کا شور" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۷(اپریل تا جون ۲۰۲۱ء)،ص۲۲۔
۳۴۔اسد بخاری،"یہ چڑیا گھر"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۷(اپریل تا جون۲۰۲۱ء)،ص ۵۱۔
۳۵۔شریف شیوہ،"اسلم کا گھوڑا"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۲۱(اپریل تا جون۲۰۲۱ء)، ص۸۸۔
۳۶۔ضیاءالحسن ضیاء،"مچھلی ہوا میں اُڑتی جائے"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۲(اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص۳۴۔
۳۷۔صائقہ علی نوری ،"عصلی گلہری" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۲۱(اپریل تا جون ۲۰۲۱ء)،ص۹۰۔
۳۸۔ایضاً،ص۹۰۔
۳۹۔رمضان گوہر،"کشمیر کے نظارے"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۲۱((اپریل تا جون ۲۰۲۱ء)،ص۷۰۔
۴۰۔ضیاءالحسن ضیاء،"مری کی وادی "مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۴(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۰ء)،ص۲۳۔
۴۱۔مشتاق حسین قادری،"پھول میرا وطن"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۴(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۰ء)،ص۲۹۔
۴۲۔ضیا ءالحسن ضیاء ،"کھیت "مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۰ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء)،ص۳۰۔
۴۳۔شکیب جالی،"صبح"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۰(جولائی تا ستمبر۲۰۱۹ء)،ص۳۲۔

۴۴۔امان اللہ نیر،"سویرا ہوا"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۲۱((اپریل تا جون۲۰۲۱ء)، ص۴۳۔
۴۵۔ شہزاد شاہد،"جاگو جاگو" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۲ (اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص۳۱۔
۴۶۔ڈاکٹر محمد ریاض شاہد،"سورج نے آنکھ کھولی"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۲(اپریل تا جون۲۰۲۲ء)،ص۲۷۔
۴۷۔ارسلان اللہ خان ،"گرمی" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۲ (اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص۳۲۔
۴۸۔ناصر زیدی،"گرمی گرمی"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد،ش۵(اپریل تا جون۲۰۱۸ء) ،ص۳۷۔
۴۹۔غلام ہمدانی مصحفی،"موسم گرما" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۲ (اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص۲۳۔
۵۰۔میراں جی ،"جنگل میں اتوار "مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۱۲ (اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص۱۲۔
۵۱۔ سمیع الوریٰ،"آو بچوں پیر لگائیں" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۲۱((اپریل تا جون ۲۰۲۱ء)،ص۶۶۔

باب سوم

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال(۲۰۲۲ء۔۲۰۱۸ء)میں فطرت سے متعلق شعور کا مطالعہ بحوالہ نثر

سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد اکادمی ادبیات پاکستان سے شائع ہونے والا رسالہ ہے۔زیر نظر تحقیق میں جولائی ۲۰۱۷ء سے لے کر جون ۲۰۲۳ء تک شائع ہونے والے چوبیس شماروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ پاکستان کی آزادی کے پچھتر سال پورے ہونے پر اٹھارہ، انیس، بیس اور اکیس کے شمارہ جات کو ڈائمنڈ جوبلی نمبر کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ ان شمارہ جات میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۲۲ء تک بچوں کے ادب کے حوالے سے جو نظمیں اور کہانیاں لکھی گئی تھی اُن کو بھی ان شمارہ جات میں شامل کیا گیا ہے۔ان چوبیس شماروں میں مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی تقریباً چھے سو سے زائد کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ان میں سے تقریباً ایک سو سے زیادہ کہانیاں فطرت کے مختلف مظاہر سے متعلق موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں خوب صورت پرندوں، پھولوں، تتلیوں، پاکستان کے دلکش مقامات، جنگلات، گلیشیرز، ندیوں، دریاؤں، بارش، چاند ستاروں اور دیگر مظاہر قدرت سے بچوں کو روشناس کروایا گیا ہے۔

ماحول کے حوالے سے عصر حاضر کا سب اہم مسئلہ ماحولیاتی آلودگی اور موسمیاتی تبدیلی ہے۔ اس مسئلے کو ادبی حلقوں نے سنجیدگی سے لیا اور کہانیوں اور نظموں کے ذریعے بچوں میں اس متعلق شعور و آگاہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سہ ماہی ادبیات اطفال میں ماحولیاتی موضوعات پر کہانیاں لکھنے کا باقاعدہ آغاز ۲۰۱۷ء میں ہوا۔ ماحولیاتی موضوعات پر مشتمل کہانیاں ان شماروں میں شامل کی گئیں جن کا تجزیہ اس باب میں کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کہانیوں میں مصنفین نے کوشش کی ہے کہ بچے فطرت سے محبت کریں ،فطرت سے سیکھیں اور فطرت کے ساتھ ظلم وزیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ تتلیوں، پرندوں اور جانوروں کو قیدی بنانا، پھول توڑنا، درختوں کو کاٹنا، آبی اور فضائی آلودگی پھیلانا وغیرہ جیسے افعال سے سخت نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

فطرت کے متعلق شعور و آگاہی اور ادبیاتِ اطفال کی نثر:

سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد میں ۲۰۱۷ سے چند مصنفین نے ماحولیاتی آلودگی کے متعلق بچوں میں شعور و آگاہی پیدا کرنے کے لیے اس اہم موضوع کی طرف توجہ دی جو کہ ادبِ اطفال کے لیے اہم سنگِ میل ہے۔ ان مصنفین میں ڈاکٹر شعیب خان اہم ہیں۔ ادبیاتِ اطفال کے شمارہ نمبر دس میں شامل ڈاکٹر شعیب خان کی لکھی ہوئی کہانی "ندی کا انتقام" ماحولیاتی آلودگی کے موضوع پر تحریر کی گئی ہے۔ مصنف کی دیگر کہانیوں میں "زمین کا مقدمہ "۲۰۲۱ء اور "طوطے کا پیغام" ۲۰۲۲ء کے شمارے میں شامل کی گئی ہے۔ اسی طرح ۲۰۱۷ کے شمارے میں فرزانہ روحی اسلم کی کہانی "چار اطخ چار بطخ "شامل کی گئی ہے جو ماحولیاتی آلودگی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔

زیر مطالعہ ادب اطفال کی چھے سو کہانیوں میں سے صرف چند کہانیاں ماحولیاتی آلودگی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کہانیوں میں بچوں کو فطرت کی بربادی، ماحولیاتی آلودگی کے مضمرات اور اس حوالے سے انسان کا کردار جیسے موضوعات پر شعور دیا گیا ہے۔ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال، شمارہ ۱۷، حصہ نثر میں ڈاکٹر شیعب خان نے ماحولیاتی آلودگی، فطرت کو لاحق خطرات اور ہماری ذمے داریاں کیا ہیں، جیسے اہم موضوع پر ایک ڈراما "زمین کا مقدمہ "شامل کیا گیا۔ اُن کا یہ ڈراما صرف بچوں کے لیے نہیں بلکہ بڑوں کے ضمیر کو بھی جھنجھوڑتا ہے کہ کس طرح انسان نے فطرت اور ماحول کی سلامتی کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔

اس ڈرامے میں زمین مدعی (ستم رسیدہ) کے طور پر انسان کے خلاف ایک مقدمہ دائر کرتی ہے۔ اس ڈرامے میں معزز جج روشنی ہے۔ ڈرامے میں بریکنگ نیوز کے طور پر یہ خبر نشر ہوتی ہے کہ زمین نے انسان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ یہ سماعت ایک کھلے مقام پر ہوتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ڈرامے میں عدالت کے تمام مراحل اور اس کے آداب و قوانین کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ زمین نے انسان پر یہ مقدمہ دائر کیا:

> "انسان نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس ماحول کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ زمین کے چھوٹے بیٹے جو درخت کہلاتے ہیں ان کا بے دردی سے قتل عام جارہا ہے۔ زمین کے بڑے بیٹے یعنی پانی کو بھی زہر دے کر قتل کرنے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے۔ جب کہ زمین کی بیٹی ہوا کو مختلف گیسوں سے زہر آلود کیا جارہا ہے"۔[۱]

اس شکایت کو سننے کے بعد روشنی جو کہ جج ہے، یہ حکم دیتی ہے کہ انسان کو فوری طور پر اس عدالت میں پیش کیا جائے۔ انسان عدالت میں پیش ہو کر ان الزمات کو مسترد کر دیتا ہے۔ جس پر زمین کہتی ہے کہ انسان نے بے دردی سے درختوں کو کاٹا اور جلایا جس سے پرندوں کے گھر تباہ ہو گئے اور اب وہ بے گھر ہیں۔ اتنے میں بہت سے پرندے

شور کرنے لگتے ہیں اور زمین کی بات کی تائید کرتے ہیں۔ زمین کہتی ہے کہ انسان پلاسٹک کے بیگوں، زہریلے کیمیائی مادوں، تیزابوں، کھاد کی تیاری میں صنعتوں سے نکلنے والے زہریلے پانی، کوڑا کرکٹ اور کیڑے مار ادویات سے میرے پانی کو آلودہ کر دیا ہے۔ فصلوں کی آبیاری اسی پانی سے ہوتی ہے جن کو انسان کھاتا ہے اور خود کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پانی میں سیسے کے ذرات کی وجہ سے بچے دماغی بونا پن(Mental Retardation) جیسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس دوران پرندوں، پانی، ہوا اور درختوں کی غم زدہ آوازیں بلند ہوتی ہیں اور وہ انسان کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ عدالت اس درخواست کو قابل سماعت قرار دیتے ہوئے انسان پر فردِ جرم عائد کر دیتی ہے۔ انسان زمین کو بات چیت کے ذریعے مسئلہ حل کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر زمین کہتی ہے:

؎ "تم دھوکے باز ہو۔ اللہ نے ہر مذہب کے لوگوں کو صفائی و پاکیزگی کا درس دیا ہے اور پانی ضائع ہونے سے بچانے کا درس دیا ہے لیکن تم گندگی پھیلا کر میری بیٹی ہوا کو زہر دیتے ہو"۔[۲]

یہ کہہ کر زمین اپنی روتی ہوئی بیٹی ہوا کو تسلی دیتی ہے اور انسان پر مزید الزامات لگاتے ہوئے عدالت سے کہتی ہے کہ انسان نے کارخانوں سے نکلنے والے دھوئیں اور گیسوں پر قابو پانے کے لیے کوئی تحرک نہیں کیا۔ ہر طرف گاڑیوں کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ زمین دہائی دیتی ہے کہ میں انسان کو پالتی ہوں، اس کے لیے طرح طرح کی فصلیں اور پھل اگاتی ہوں، اس کو اپنا پانی پلاتی ہوں جو ماں کے دودھ جیسا ہے اور اس سے انسان زندہ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ میری پاکیزہ ہوا کے ذریعے انسان سانس لیتا ہے۔ انسان جواباً یہ کہتا ہے کہ زمین اگر فصل اگاتی ہے تو بیج انسان ہی بوتا ہے۔ اس پر زمین کہتی ہے کہ اگر انسان کے بچوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ سب بیجوں کو جلا دیتی۔ اس طرح اگلی سماعت میں زمین مزید شکایت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ انسان نے درخت کاٹ ڈالے اور رہائشی کالونیاں بنائیں، زہریلی گیسوں سے ہوا کو آلودہ کر دیا۔ کوڑا کرکٹ، پلاسٹک اور ٹائر وغیرہ جلنے سے ہوا کا دم گھٹ رہا ہے۔ تابکاری کی شعائیں بھی میری بیٹی ہوا کو مار رہی ہیں۔ یہ سب سن کر عدالت انسان کے اعتراض کو مسترد کر دیتی ہے اور زمین اپنے بڑے بیٹے پانی پر ہونے والے مظالم کی روداد سنانے لگتی ہے:

؎ "عزت مآب! میرا تین چوتھائی حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ میرا بیٹا پانی ندیوں، سمندروں، جھیلوں، گلیشئرز اور دریاوں کی صورت میں زندگی گزار رہا ہے۔ جنگلات کے خاتمے کی وجہ سے میرا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے۔ اس کی وجہ سے گلیشئرز پگھل رہے ہیں جس سے سمندر کے پانی کی سطح بلند ہو رہی ہے اور خشکی کا وجود ختم ہوتا جا رہا ہے۔ انسان گھریلو، صنعتی اور زرعی کثافتوں کے ذریعے میرے پانی کو نقصان پہنچا رہا ہے"۔[۳]

گھریلو کثافتوں میں شیشہ، پلاسٹک بیگ، انسانی فضلہ، دھاتیں، صابن اور دیگر زہریلے کیمیائی مادے شامل ہیں۔ صنعتی کثافتوں میں کار خانوں سے کرومیم میتھین، پارے، سیسے اور آرسینک کے مرکبات جب کہ زرعی کثافتوں میں سپرے، کیڑے مار ادویات، کیمیائی کھادیں وغیرہ شامل ہیں جو پانی میں شامل ہو کر اس میں سے آکسیجن کو ختم کر دیتے ہیں۔

عدالت میں زمین اپنے چھوٹے بیٹے یعنی درختوں کے متعلق اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ہر سال دنیا میں تقریباً تیرہ ملین ایکڑ رقبے پر پھیلے جنگلات کو برباد کر دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے میری باقی اولاد بھی متاثر ہے۔ درخت سیلابوں کو روکتے ہیں نیز درختوں کی کمی کی وجہ سے کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوا میں ہی رہ کر فضا کو آلودہ کر رہی ہے۔ درخت انسان کو اس قدر فائدہ دیتے ہیں کہ یہ کہہ کر زمین زار و قطار رونے لگتی ہے پھر کہتی ہے کہ:

"درختوں کا قتل دراصل انسانیت کا قتل ہے۔"[۴]

انسان کہتا ہے کہ وہ صنعتیں اپنے فائدے کے لیے لگاتا ہے۔ کیمیائی کھاد سے فصلیں اچھی اور مقدار میں زیادہ ہوتی ہیں اور آبادی میں اضافے کے پیش نظر درختوں کو کاٹنا پڑتا ہے۔ یہ سب سننے کے بعد جج یعنی روشنی فیصلہ محفوظ کرتی ہے اور کچھ دیر بعد سناتی ہے جس کی میڈیا پر خوب تشہیر ہوتی ہے۔ فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ:

"فریقین کے دلائل سننے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ انسان گناہ گار ہے۔"[۵]

عدالت اپنے فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے انسان کو زمین، ہوا، جنگلات اور پانی پر ہونے والے ظلم اور اس کے انجام سے خبر دار کرتی ہے۔ قطبین پر جمی برف موسمی حدت کی وجہ سے تیزی سے پگھلنے لگی ہے جس کی وجہ سے دنیا کی ناقابل تصور تباہی یقینی ہے۔ اس طرح گلوبل وارمنگ دنیا کو برباد کر سکتی ہے۔

عدالت کہتی ہے کہ گلوبل وارمنگ کو صرف اور صرف درختوں کے ذریعے ہی شکست دی جا سکتی ہے مگر افسوس کہ آج بھی انسان کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ انسان آج بھی درختوں کو بے رحمی سے کاٹ رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ درخت لگانا اور ان کی دیکھ بھال کرنی چاہیے نیز آنے والی نسلوں کو بھی شجر کاری کے فوائد اور اس کی اہمیت سے روشناس کرانا چاہیے۔ صاف ستھرے ماحول میں زندگی گزارنے کے لیے انسان کے ماحول کو آلودہ ہونے سے بچانا چاہیے نیز ترقیاتی منصوبوں میں ماحول اور فطرت کی بقا کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام میں اس کا شعور بھی بیدار کیا جانا چاہیے آخر زمین انسان کی ماں ہے۔ انسان کو چاہیے کی زمین کا احترام کرے اور دھرتی ماں کے

تمام مطالبے پورے کرے۔ یہ سب سن کر انسان نے زمین سے معافی مانگ لی اور اس کو ہمیشہ سر سبز و شاداب رکھنے کا وعدہ کیا۔ یہ ڈرامہ درج ذیل نظم پر اختتام پذیر ہوتا ہے:

؎ زمیں کی گود رنگ سے امنگ سے بھری رہے

خدا کرے، خدا کرے سدا ہری بھری رہے[۶]

ڈاکٹر شعیب خان نے اس تحریر میں انسان کے ہاتھوں فطرت اور ماحول کی تباہی کے بارے میں شعور اجاگر کیا ہے۔ موسمیاتی تبدیلیوں اور فضائی آلودگی جیسے خطرات کو کم کرنے کا سب سے بنیادی حل بڑے پیمانے پر درخت لگانا اور ان کی آبیاری و حفاظت کرنا ہے۔ جنگلات انسان اور دیگر حیوانات کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ دنیا بھر میں وسیع رقبے پر پھیلے جنگلات آئندہ بیس تیس سالوں میں انسان اور دیگر نباتات و حیوانات کی بقا کے لیے درکار ہوں گے اتنے جنگلات جتنے نو آبادیات سے پہلے تھے۔ اس ڈرامے میں ماحولیاتی انصاف کی بات کی گئی ہے۔ اس میں اس امر کی ضرورت کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ انسان اپنی ضروریات کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ فطرت اور ماحول کی بقا کے لیے بھی اقدامات کرے۔

ڈاکٹر شیعب کی کہانی "طوطے کا پیغام" میں ماحولیاتی آلودگی پھیلانے میں انسان کے کردار اور ماحولیاتی آلودگی کے نقصانات جو کہ انسانوں، نباتات اور حیوانات سب کے لیے ہیں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف کو موسمی تبدیلیوں سے لاحق خطرات کا ادراک ہے اور وہ ان لکھاریوں میں شامل ہیں جو بچوں کو ماحول کے بارے میں آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ آج کے دور کے اہم امور میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شعرا اور ادیب فطرت کی دلکشی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ فطرت اور ماحول کی تباہی کی وجوہات بیان کرنے اور اس کے تدارک میں بھی اپنا کردار ادا کریں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک چرواہا ہے جو گاؤں میں رہتا ہے۔ اس نے ایک بولنے والا طوطا بھی پال رکھا ہے جو اس کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے۔ چرواہا ایک فطرت کے رنگوں سے بھرپور گاؤں میں رہتا ہے جس کے قریب ایک جنگل بھی ہے۔ وہاں اس کی بکریاں ہری ہری گھاس کھاتی ہیں اور قریب ہی موجود ایک شفاف پانی کے جھیل سے پانی پیتی ہیں۔ کہانی میں مصنف بیان کرتا ہے:

؎ ''اس جنگل میں چرواہا پر سکون رہتا۔ وہ بکریوں کو چرنے کے لیے چھوڑ کر خود پھل توڑنے کے لیے نکل جاتا۔ پھلوں کو جھیل کے پانی سے دھوتا، کچھ پھل طوطے کو دیتا، کچھ خود کھاتا اور باقی گاؤں والوں کے لیے لے جاتا''[۷]

اس کہانی کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف بچوں کو پھل دھو کر کھانے، پہلے وہ طوطے کو کھلاتا پھر خود کھاتا اور گاؤں والوں کا بھی خیال رکھتا ہے جیسے اخلاقی سبق دے رہا ہے۔ اس کہانی میں فطرت کے خلوص کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ کہانی میں مصنف بیان کرتا ہے کہ کچھ عرصے بعد بکریوں کا ریوڑ تیار ہو گیا اور چرواہا اس کو لے کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کو کئی دن تک پیدل سفر کرنا تھا۔ راستے میں پھلوں سے لدے درخت، میدان، پہاڑ، شفاف پانی کے ذخیرے، خوش الحان پرندوں کی آوازیں اور سبزہ زاروں کے طوطے تھے جنھوں نے چرواہے اور بکریوں کو پریشان ہونے نہ دیا۔ جہاں شام ہو جاتی، قافلہ قیام کر لیتا۔ راستے میں کئی نوسربازوں اور جرائم پیشہ لوگوں سے بچتا بچاتا وہ شہر کی منڈی تک پہنچ گیا۔ اس شہر کی منڈی میں درخت نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک بکری کو ٹیکس کے طور پر دینے کے بعد ہی چرواہے کو منڈی میں بکریاں رکھنے اور فروخت کرنے کی اجازت ملی۔ شہر میں درخت اور پتے نہیں تھے۔ بکریاں بھوک سے نڈھال ہو گئیں اور گندی نالیوں میں بہتا بدبو دار پانی پینے پر مجبور ہو گئیں۔ وہ بھوک کے مارے کوڑے دانوں میں پڑے سبزی کے چھلکے کھانے لگیں۔ اگلے دن منڈی میں بکریاں بیمار پر گئیں اور ان کو دیکھنے کے لیے کسی ماہر امراض حیوانات کو بلایا گیا لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی تین بکریاں دم توڑ چکی تھیں۔ طبیب نے دیکھ کر بتایا کہ بکریاں سبزی کے چھلکوں کے ساتھ پولیتھین بیگز کھانے کی وجہ سے مر گئی ہیں۔ جب مزید بکریاں بیمار پڑنے اور مرنے لگیں تو لوگ جمع ہو گئے اور ذرائع ابلاغ کے نمائندے بھی آ گئے ماہر امراض حیوانات نے اُن کو بتایا کہ:

> "قدرت نے دنیا کو بہت خوبصورت انداز میں تخلیق کیا ہے۔ اس کے ماحول کو حسین اور دل کش بنایا ہے۔ اس کے ہر عمل میں ایک ترتیب پائی جاتی ہے۔ تمام حیوانات اور نباتات ایک عمل کے ساتھ پیدا ہو کر مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاتے ہیں۔ لاکھوں سالوں سے جاری اس عمل سے دنیا کے حسن پر کبھی منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے لیکن حیرت ہے کہ انسان کی سائنسی ایجادات اور صنعتی انقلاب نے انسان کے لیے ان گنت مسائل پیدا کر دیے ہیں جن میں ایک مسئلہ یہ شاپنگ بیگ بھی ہیں"۔[۸]

اس دوران دیگر لوگوں کے ساتھ چرواہے کا طوطا بھی ہمہ تن گوش تھا۔ طبیب نے مزید کہا کہ کھیل کے میدان ہوں یا کوئی خالی جگہ، بازار ہوں دریا یا سمندر یہاں تک کہ درختوں کی شاخوں پر بھی ہر جگہ شاپنگ بیگ نظر آتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل لوگ برتن میں دودھ لیتے تھے اور دیگر اشیا کی خریداری کے لیے بھی گھر سے کپڑے کے تھیلے لے کر جاتے تھے۔ دکاندار بھی کاغذ یا نباتات سے بنی ہوئی ٹوکریوں میں سبزی پھل وغیرہ ڈال کر دیتے تھے۔ پلاسٹک میں پائے جانے والے کیمیائی اجزا انسانی صحت کے لیے مضر ہیں۔ جب کوڑے کو جلایا جاتا ہے تو پلاسٹک کے جلنے سے نکلنے

والا زہریلا دھواں سانس کی بیماریوں اور کینسر کا سبب بنتا ہے۔ اس کے علاوہ پلاسٹک نکاسی کے نظام کو بھی متاثر کرتا ہے۔ پلاسٹک کی صنعت سے اب لاکھوں لوگوں کا روز گار وابستہ ہو چکا ہے اس لیے اس کو ایک دم ختم کرنا مشکل اور نقصان کا باعث ہے لہٰذا اس کو بتدریج ختم کرنا ہو گا۔ اس کے لیے کاغذ اور کپڑے کے تھیلوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہو گی۔

اس کے بعد شہریوں نے چرواہے کی مالی مدد کی اور اسے تسلی دی۔ چرواہے نے مزید بکریاں خریدیں اور گاؤں واپس چلا گیا۔ اب وہ جگہ جگہ لوگوں کو پلاسٹک بیگز کے نقصانات سے آگاہ کرنے لگا۔ مصنف بیان کرتا ہے کہ:

> "چرواہے نے طوطے کو کہا کہ اچھے طوطے تم فوراً روانہ ہو جاؤ اور دنیا کو موت سے بچاؤ۔ طوطے نے چرواہے کو سلام کیا اور پھر اڑ گیا۔ اڑتے اڑتے وہ کہتا تھا: "پلاسٹک کے شاپنگ بیگ موت ہے۔ شاپنگ بیگ کا استعمال بند کرو۔" چرواہا طوطے کو آنکھوں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا جو زندگی کا پیغام پہنچانے نکلا تھا"۔[۹]

بلاشبہ مصنف نے بچوں کی توجہ ماحولیاتی آلودگی کے ایک اہم محرک یعنی شاپنگ بیگز کی طرف مبذول کروائی ہے۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ والدین بچوں کو دودھ لینے بھیجیں تو سٹیل کا صاف ستھرا برتن دیں اور گھر سے شاپنگ کے لیے نکلیں تو کپڑے کے تھیلے ساتھ لے کر جائیں جیسا کہ چالیس سال پہلے ہوتا تھا۔ پلاسٹک بیگ کے اندھا دھند استعمال نے نکاسی آب سے لے کر سمندروں تک کو گدلا کر دیا ہے اور فضاؤں کو آلودہ کر دیا۔ یہ ایک قابل علاج مرض ہے، بس شعور و آگاہی کی ضرورت ہے۔ حکومتیں بھی اس سے باخبر ہیں۔ پاکستان میں سندھ حکومت پندرہ جون ۲۰۲۵ء سے پلاسٹک بیگ پر پابندی لگانے جا رہی ہے۔ اسلام آباد میں ۲۰۱۹ء سے پابندی عائد ہے۔ خیبر پختون خواہ میں دسمبر ۲۰۲۴ء میں کم موٹائی والے پلاسٹک بیگ کے خلاف مہم کا آغاز ہوا۔ پنجاب میں بھی بظاہر پابندی عائد کی جا چکی ہے۔ ملک میں اس مسئلے کے تدارک کے لیے قانون بھی موجود ہے اور سزا بھی مگر پھر بھی پلاسٹک بیگ کی صنعت فعال ہے۔ اس طرح قانون کے نفاذ میں کئی چیلنجز درپیش ہیں۔

شعرا اور ادبا کا کام سوئے ہوئے اور بے حس ذہنوں کے دروازے پر دستک دینا اور آنے والی نسلوں کو فطرت پسند اور پاکیزہ ماحول دوست شہری بنانا ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے گاؤں کے سبزہ زار، شفاف پانی اور آب و ہوا اور شہر کے آلودہ ماحول کا تقابل کر کے نہ صرف بچوں کو شعور و آگاہی فراہم کی ہے بلکہ ہر انسان کے ذہن و ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

فرزانہ روحی اسلم کی کہانی "چار اطخ چار بطخ" بھی ماحولیاتی آلودگی کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں پرندے اور دوسرے جاندار انسان (جو کہ اشرف المخلوقات ہیں) سے سخت نالاں ہیں کہ فطرت اور ماحول کو انسان نے ہی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ آلودہ، گندے اور عقل سے فارغ انسان ہی ماحولیاتی آلودگی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ چار بطخوں کی کہانی ہے جو تھوڑی دیر تالاب میں تیرنے کے بعد واپس کنارے پر آ گئیں کیوں کہ تالاب کا پانی کوڑے کرکٹ ،پلاسٹک کے تھیلوں، آئس کریم کے کپ اور دیگر غلاظتوں کی وجہ سے بدبودار ہو گیا تھا۔ بدبو نے بطخوں کا سانس بند کر دیا۔ وہ جھاڑی کے نیچے اداس ہو کر بیٹھ گئیں اور پرانے وقتوں کو یاد کرنے لگیں۔

> "جب نہ دنیا گندی تھی نہ دریا کا پانی کثیف تھا۔ وہ پانی میں ریس لگاتیں، پانی میں ہنگامہ برپا ہوتا اور لوگ لطف اندوز ہوتے۔ تب آسمان سے آگ نہیں برستی تھی، درختوں کے سائے کم نہ تھے اور نہ زمین کروٹ لیتی۔ بادل بھی خوب برسا کرتے، جگہ جگہ سبزہ سر اٹھاتا، پرندے درختوں پر اور چوپائے زمین پر اٹھکیلیاں کرتے اور آدم زاد امن وچین کی بانسری بجاتے"۔[۱۰]

مصنفہ نے ماضی کے صاف وشفاف ماحول اور فطرت کے حسین رنگوں کی درست منظر کشی کی ہے۔ بطخیں جھاڑی کے نیچے بیٹھی تھیں اور جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو ایک اجنبی مخلوق ظاہر ہوئی اور بطخ سے پوچھا کہ تم بطخ ہو؟ بطخ نے ڈرتے ہوئے جواب دیا کہ ہم بطخ نہیں اطخ ہیں۔ ہم بطخ سے ملتی جلتی بے کار، بے فائدہ اور بیمار شے یعنی اطخ ہیں۔ اس عجیب وغریب مخلوق نے بطخوں کو تسلی دی کہ ہم پرندے اور دوسرے حیوانات کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ ہم اس پانی کو صاف کرنے آئے ہیں۔ بطخ نے اس مخلوق کو بتایا کہ انسان درخت کاٹ کر لے گئے ہیں۔ اس مخلوق نے کہا کہ ہم درخت تو لگا دیں گے مگر کیا بطخیں درخت پر چڑھ سکتی ہیں؟ اس پر بطخ نے جواب دیا کہ درخت ہوں گے تو پرندے آباد ہوں گے۔ درختوں کے بغیر ہم اس اجاڑ دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ اس مخلوق نے دیکھا کہ گندے پانی کی وجہ سے مچھلیاں کم ہوئی ہیں۔ اس نے سوچا کہ یہاں پھول بھی ہونے چاہئیں تاکہ تتلیاں، بھونرے اور جگنو بھی نظر آئیں۔ اجنبی مخلوق نے پانی اور ماحول کو صاف ستھرا کر دیا۔ صبح نمودار ہوتے ہی ایک شخص بوری اٹھائے تالاب کے کنارے آ پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی بطخوں نے اجنبی مخلوق کو بتایا کہ یہ وہی ہے جس نے اس دنیا کے حُسن کو تباہ کر دیا ہے اور اتنے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص نے بوری کو پانی کے کنارے الٹ دیا۔ کوڑا کرکٹ بوری سے نکلا تو فضا میں ہر طرف ناگوار بدبو پھیل گئی۔ اجنبی مخلوق نے اس شخص پر جال پھینکا اور اسے لے کر آسمان کی طرف لے گئی۔ اگلے چند دنوں تک جو بھی آدمی گندگی پھیلانے آتا، اجنبی مخلوق یہ کہہ کر اس کو اٹھا لے جاتی کہ دنیا کو بدصورت اور گندا کرنے والوں کو ہم دنیا میں رہنے کے صحیح رنگ ڈھنگ سکھائیں گے۔ اس کے بعد خوف کے مارے لوگوں نے تالاب کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ پانی صاف ہو گیا جس کی وجہ سے بطخوں کو چین نصیب ہوا اور ان کے

بال و پر نکھر گئے۔ پرندوں نے درختوں کو پھر سے اپنا مسکن بنالیا۔ چڑیاں گیت گانے لگیں اور بطخیں پانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گانے لگیں:

؎چار اطخ چار بطخ، ہم پانی کی رانی

انسان سے جان چھوٹی ہماری حکمرانی "

فرزانہ روحی اسلم کی یہ کہانی فطرت اور دیگر حیوانات کی طرف سے انسان کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ ہے۔ جو دلچسپ پیرائے میں تخلیق کی گئی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کے متعلق شعور اور آگاہی کے سلسلے میں یہ کہانی بچوں کے لیے ایک عمدہ سبق ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسی کہانیاں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے سپیکرز کے ذریعے ممبران اسمبلی کو سنائی جائیں تو بہت مناسب ہو گا۔ اب تعلیم بالغاں کی اشد ضرورت ہے۔ کہی ایسا نہ ہو کی آج کے باشعور بچے جب تک جوان ہوں تو پانی سر سے گزر چکا ہو۔

کہانی "تم نہ سمجھو گئے" ماحولیاتی آلودگی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ یہ ایک دلچسپ کہانی کے۔ ایم خالد نے لکھی جو فطرت کو لاحق خطرات اور ہماری ذمے داریاں اور فطرت کے متعلق شعور و آگاہی جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ مصنف نے بچوں میں فطرت اور ماحول کا شعور اجاگر کرنے کے لیے ایک جنگل کا ذکر کیا ہے جو وبائی امراض کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ جنگل میں موجود جانور پیٹ کے درد، قے اور دست کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔

اس جنگل میں ایک ہی طبیب ہوتا تھا جس کو 'بھالو میاں' کہا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بیٹے بھی تھے جو اس کا ہاتھ بٹاتے بیماری تیزی سے پھیل رہی تھی اور دوا کے طور پر استعمال کی جانے والی جڑی بوٹیوں کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ کئی جانور اور اُن کے بچے اس بیماری کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ جنگل کے بادشاہ شیر کے بیٹے کو بھی بیماری لگی تو بھالو چیک کرنے نہ جاسکا تو شیر اپنی شیرنی کے ہمراہ بیٹے کو لے کر ہسپتال پہنچ گیا۔ بھالو میاں نے معذرت کی اور چوہیا کے بچے کو چیک کرتے ہوئے کہا کہ یہ بھی تو آپ کی ہی رعایا ہے۔ اس وجہ سے میں حاضر نہ ہو سکا۔ منا شیر دست کی بیماری میں مبتلا تھا طبیب نے اس کا علاج کیا اور شیر نے بھالو میاں کی تجویز پر سب جانوروں کی ہنگامی میٹنگ طلب کرلی تاکہ بیماری کی وجوہات اور اس کے سدِباب کے حوالے سے کوئی راہ حل نکل آئے۔ مصنف نے بچوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے بہت دلچسپ جملے تحریر کیے:

"ڈاکٹر بھالو نے ایک لمبے کانٹے کو دوائی میں بھگو کر ٹیکہ لگایا تو ننھا شیر چیخا اور رونا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار پر کلینک میں موجود جانوروں کے بچوں خصوصاً بندر اور چوہیا کے بچوں نے کھی کھی کرنا شروع کر دی۔ ننھا شیر ان کی کھی کھی سن کر کھسیانا ہو کر چپ ہو گیا"۔ [۱۲]

چوں کہ شیر کا بچہ تھا اور شیر کو بہادری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ندیا کے کنارے چاند رات میں شیر کی صدارت میں میٹنگ شروع ہوئی۔ ماحول افسردہ تھا۔ سب سے پہلے لومڑی نے بولنے کی اجازت چاہی۔ لومڑی نے کہا کہ کئی مریض دم توڑ چکے ہیں۔ دوائیاں کم ہیں اور طبیب صرف ایک ہے۔ اس جنگل سے بھاگ کر کہاں جائیں؟ اس کے بعد بھالو میں نے وبا کی وجوہات بتائیں۔ اس نے بتایا کہ وبا کی وجہ سکول میں بکنے والی کھانے پینے کی اشیا ہیں۔ الو بول پڑا کہ یہ الزام ہے اور کہا:

"چند ایک غلیظ بندروں نے جو انسانی قید سے چھوٹ کر آئے تھے، کھٹے آلو چھولے، چٹ پٹی املی اور ایسی دیگر اشیا فروخت کرنے کی کوشش کی جن کو پہلے میں نے خود چیک کیا اور پھر معیاری نہ ہونے کی وجہ سے فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی"۔ [۱۳]

اس اقتباس میں انسان پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ بندروں نے انسانوں کی صحبت کی وجہ سے ناقص اشیا فروخت کرنے کی کوشش کی۔ بھالو نے اپنی تھوتھنی اٹھائی اور کچھ سونگھنے اور سوچنے لگا۔ اس کے بعد اس نے بندر سے ندی سے پانی لانے کو کہا اور بندر ناریل کے پیالے میں ندی کا پانی بھر کر لے آیا۔ بھالو میاں، شیر اور بن مانس نے پانی سونگھا اور سرد آہ بھر کر کہنے لگے کہ ندی کا پانی انتہائی زہریلا ہو چکا ہے۔ خرگوش نے جنگل چھوڑ کر بھاگنے کا مشورہ دیا۔ لنگور نے ڈر کر کہا کہ آئندہ وہ بچوں کو اور خود کو صاف ستھرا رکھے گا اور صاف آلو چھولے کھلائے گا۔

شیر نے الو کو ندی پر بھیجا کہ حالات کا جائزہ لے اور کھوج لگائے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ واپسی پر الو نے بتایا کہ ہر طرف پرندے مرے پڑے ہیں۔ شہر کی طرف سے آنے والی ایک اور ندی ہماری پرانی ندی میں گر رہی ہے۔ شیر نے پوچھا کہ اگر ایک ندی دوسری ندی میں گر رہی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آخر پانی پانی میں گر رہا ہے۔ اس پر بن مانس نے کہا کہ مجھے بچپن میں کچھ سائنس دان قسم کے لوگ اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں نے انسانوں کے درمیان کئی سال گزارے ہیں

"انسان کا گھناؤنا پن ہماری حیوانیت سے زیادہ گھناؤنا ہے۔ وہ ضرور اپنی فیکٹریوں کا کیمیکل اور انسانی غلاظت اس ندی میں ڈالتے ہوں گے"۔ [۱۴]

یہ سن کر سب جانوروں نے مل کر ایک منصوبہ بنایا اور حکمت عملی کے تحت دو بندر اور ایک چیتا شہر کے میئر کے بیٹے کو اٹھالائے اور تمام پرندے اور جانور احتجاج کرتے ہوئے شہر کے باہر جمع ہو گئے۔ پولیس چیف اور میئر نے جانوروں سے کہا کہ آپ سب جانور انسانوں کی طرح مہذب نہیں ہیں۔ اس پر بن مانس کی آواز گونجی:

"اے انسانیت کے علمبر دارو! کیا ماحول پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے؟ ہم انسان نہ سہی جاندار تو ہیں۔ ہمارے احساسات بھی تم جیسے ہیں۔ میئر کا بچہ مل جائے گا کیوں کہ ہم جانور ہیں، انسان نہیں۔ ہمارے سینکڑوں بچے مر چکے ہیں۔ مہربانی کر کے شہر سے آنے والی مصنوعی ندی کو بند کرو"۔[۱۵]

میئر نے جانوروں کا مطالبہ مانتے ہوئے شہر سے آنے والی ندی کو بند کروا دیا اور جانوروں نے اس کا بیٹا واپس کر دیا۔ میئر کو جانوروں کا احساس ہوا اور اس نے ندی کو صاف کرا دیا اور جانوروں کے بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگوائے۔ ایک تحریری معاہدہ ہوا جس میں انسانوں کی طرف سے میئر نے اور جانوروں کی طرف سے بن مانس نے دستخط کیے۔ اس کہانی میں کے ۔ ایم خالد نے جنگل میں وبا پھوٹنے ، جانوروں کی ہلاکتوں اور جانوروں کی تشویش اور اضطراب کی زبر دست منظر کشی کی ہے۔ اس کہانی میں انسان کے ضمیر کو خوب جھنجوڑا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ صنعتی ترقی کے بعد انسان بہت حد تک بے حس ہو گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قانون نافذ کرنے والے اداروں، مقتدر حلقوں اور مالکان کو علم نہیں ہے کہ کار خانوں سے نکلنے ولا دھواں اور پانی میں شامل ہونے والے مادے نباتات، حیوانات اور خود انسان کے لیے زہر قاتل ہیں۔ متعلقہ ادارے اس پر بلکل خاموش ہیں۔ اس کہانی کے ایک کردار بن مانس نے سچ کہا ہے کہ "انسان کا گھناؤنا پن جانوروں کی حیوانیت سے زیادہ خطرناک ہے اس کہانی کے آخر میں جب جانوروں کے احتجاج کی وجہ سے انسان کا ضمیر بیدار ہوا تو اس نے جانوروں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک بھی کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔

فریدہ حفیظ نے کہانی "ندی کے سفر" کی خوب صورت انداز میں روداد بیان کی ہے۔ ندیا کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ دراصل اس کہانی میں پانی سے متعلق قدرت کے اس نظام اور عمل کا ذکر کیا گیا ہے جس کے تحت گرمی کی شدت سے گلیشئرز پگھلتے ہیں۔ یہ پانی آبشار سے ندی، پھر ندی سے دریا اور دریا سے زمینوں کو سیر اب کرتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔

دھوپ کی حدت سے سمندر اور جنگلات میں موجود پانی بھاپ کی صورت میں فضا میں بلند ہوتا ہے۔ اس طرح بادل بنتے ہیں اور پھر یہی کالی گھٹائیں ہواؤں کے سنگ برکھا بن کر برستی ہیں۔ جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بارش ہوتی ہے تو وہ

درجہ حرارت کی شدید کمی کی وجہ سے برف یا گلیشئرز کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور صدیوں سے ان پہاڑوں پر گلیشئرز تہ در تہ جما ہوا ہے۔ پانی کی نقل و حرکت کا یہ سلسلہ زمین پر اسی طرح جاری رہتا ہے۔ فریدہ حفیظ نے اس کہانی کے ذریعے بچوں قدرت کے اس خوب صورت نظام سے روشناس کروایا ہے۔ کہانی میں سب سے پہلے بچوں کو گلیشئرز کے متعلق آگاہی فراہم کی جاتی ہے۔

> "بہت اونچے اونچے پہاڑوں پر ہر وقت برف جمی رہتی ہے۔ وہاں درخت نہیں اگتے نہ پھول، نہ پودے۔ گھاس کا ایک تنکا بھی نظر نہیں آتا۔ نہ درخت نہ جھاڑیاں نہ پھول، بس برف ہی برف۔ سفید دودھیا رنگ کی چادر ہر طرف بچھی ہوئی ہوتی ہے۔ ابھی پہلی برف پگھل نہیں پاتی کہ مزید برف پڑ جاتی ہے"۔[۱۶]

گلیشئر کا وزن جب بڑھ جاتا ہے تو نچلی تہیں سرکنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ دھوپ کی وجہ سے بھی برف پگھلتی رہتی ہے۔ یہ پانی دودھ کی مانند سفید جھاگ دار آبشار کی صورت میں پہاڑ سے نیچے اترتا ہے اور وادیوں اور تنگ پہاڑیوں میں پہنچ کر ندی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ جب اسی طرح کے بہت سارے ندی نالے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو دریا بن جاتا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں دریا کم چوڑے، شور مچاتے اور تیزی سے بہتے ہیں۔ ان دریاؤں پر ٹربائن لگا کر بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر ندیا کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر جھیل کی صورت اختیار کرتا ہے۔

میدانی علاقوں میں دریا کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے۔ دریا سے نہریں نکالی جاتی ہیں اور کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ اس سے میدانی علاقوں میں چاول، گندم، کپاس اور دیگر فصلوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ باقی دریا کا پانی سمندر کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح کچھ پانی زمین میں جذب ہوتا ہے، وہاں سے درختوں اور پودوں میں سما جاتا ہے اور پھر دھوپ پڑنے پر بھاپ میں بدل جاتا ہے۔ "اسی لیے تو کہتے ہیں کہ خوب ہریالی پیدا کرو۔ صرف سمندر ہی بادل نہیں بناتے، جنگل بھی یہ کام کرتے ہیں۔ اس بات پر کہانی کا اختتام ہوتا ہے۔

ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے اس قدرتی نظام میں شدید خلل واقع ہوا ہے۔ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے بارش کم اور بے موسمی ہوتی ہے اور جب ہوتی ہیں تو انتہائی شدید۔ گلیشئر جو پانی کا اہم ذخیرہ ہیں، موسمی حدت کی وجہ سے پگھلتے جا رہے ہیں جس سے سیلاب آنا اور سمندر کے پانی کی سطح کا بلند ہونا جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر اس موسمیاتی تبدیلی کو سنجیدگی سے زیر غور نہ لایا گیا اور آلودگی پر قابو نہ پایا گیا تو ماہرین کے مطابق ۲۰۵۰ء تک اس کے بھیانک نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ یہ کہانی فطرت کے متعلق شعور اور آگاہی فراہم کرتی ہے اور بچوں کو درخت لگانے اور ہریالی

میں اضافہ کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ موسمیاتی تبدیلی اور اس کے مضر اثرات سے بچنے کے لیے دنیا بھر میں جنگلات کی حفاظت اور بڑے پیمانے پر درخت لگانا ضروری ہے۔

طوبیٰ صدیقی کی کہانی "کھٹ بڑھی" میں انھوں نے فطرت کے دلکش پرندے ہُدہُد کو موضوع بنایا ہے۔ معاذ، بلال اور عثمان تینوں دوست ہیں اور جماعت ششم کے طالب علم ہیں۔ معاذ گیلی مٹی سے مچھلیاں اور پرندے بناتا ہے۔ ایک دن اس نے ایک خوبصورت پرندہ بنایا۔ دوستوں کے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس پرندے کا نام 'کھٹ بڑھئی' ہے۔ عثمان نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ بڑھئی تو لکڑی کا کام کرنے والے کو کہتے ہیں، یہ پرندے کا نام کیسے ہو گیا؟ معاذ نے بتایا کہ اس پرندے کے متعلق مجھے میرے بابا نے بتایا تھا۔ بلال اور عثمان کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا اور پھر طے پایا کہ سکول کی سائنس ٹیچر سے پوچھا جائے گا۔ جب ٹیچر سے پوچھا گیا تو ٹیچر نے معاذ کی بات کی تائید کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ یہ ایک پرندہ ہے۔

> "کھٹ بڑھئی کا شمار دنیا کے خوبصورت ترین پرندوں میں ہوتا ہے۔ اس کا تعلق پرندوں کے پاسیڈی (Picidae) سے ہے۔ اس پرندے کو آپ اس لیے نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ یہ زیادہ تر گھنے جنگلات یا درختوں کے ذخیرے میں پایا جاتا ہے"۔[۷]

ٹیچر نے مزید بتایا کہ شوخ پروں والا یہ پرندہ وزن میں سات گرام سے آدھا کلو تک کا ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے دیہاتوں میں یہ پرندہ درخت کے تنے پر بیٹھ کر اپنی تین انچ لمبی نوکیلی چونچ سے تنے پر مسلسل ضربیں لگا رہا ہوتا ہے جیسے کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ اس سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ درختوں میں سوراخ کر کے ان میں موجود کیڑوں کو کھاتا ہے اور درختوں کو مختلف بیماریوں سے بچاتا ہے۔ یہ پرندہ انسانوں سے بھی جلدی مانوس ہو جاتا ہے اگر گھروں میں بڑے درخت ہوں تو یہ پرندہ وہیں بسیرا کر لیتا ہے۔

اس کہانی میں طوبیٰ صدیقی نے فطرت کے ایک حسین مظہر پرندے جیسے اردو میں ہُدہُد کہا جاتا ہے اس سے بچوں کو روشناس کروایا ہے۔ لمبی مضبوط چونچ والا اور سر پر تاج سجائے یہ پرندہ پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھارت اور مشرق وسطیٰ کے کچھ ممالک میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پرندہ مصر، الجزائر، تیونس، مشرقی یورپ، سپین، فرانس اور اٹلی میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ شدید سردی میں یہ پرندہ ہجرت کر جاتا ہے اور یہ وہی پرندہ ہے جو ملکہ بلقیس کی خبر لایا تھا البتہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ فضائی آلودگی، موسمیاتی تبدیلیوں اور درختوں کے مسکن کی عدم دستیابی کے باعث دیہاتوں میں بھی یہ پرندہ اب کم کم دکھائی دیتا ہے اور شہروں کا حال یہ ہے کہ اسٹانی بچوں کو کھٹ بڑھی کا پتلا دیکھا کر اس پرندے کے متعلق آگاہ کر رہی ہے۔

بظاہر یہ کہانی بہت دل چسپ ہے لیکن اس دور کا ایک المیہ بھی ہے کہ ہمارے بچوں نے ہُدہُد نہیں دیکھا بچے فطرت سے اس قدر دور ہو گئے ہیں کہ بہت سے جانور اور پرندے ان کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ جدید مصنوعی دور میں قدرتی ماحول کی اس قدر کمی ہے کہ بچوں کو فطرت اور اس کے حسین رنگوں کو دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ اس کہانی کو مستقبل کے دنوں کے بارے میں دیکھا جانے والا ایک ڈراؤنا خواب کہنا غلط نہ ہو گا کیوں کہ اگر یہی صورت حال رہی تو اگلے تیس چالیس سالوں میں بہت سے پرندے، تتلیاں اور جگنو معدومیت کے خطرے سے دوچار ہو چکے ہوں گے اور بچوں کو تصویروں، کھلونوں اور مٹی کے پتلوں وغیرہ کے ذریعے فطرت کے ان حسین مظاہر کے ماضی کے قصے سنائے جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ فطرت کا انتقام بہت سخت ہوتا ہے۔ ولیم وڈزورتھ کہتا ہے کہ فطرت بے حد مہربان اور حسین ہے جب کہ مشہور فلاسفر کولرج فطرت کے قہر و غضب کی بات کرتا ہے۔ پھر بھی فطرت بے وفا نہیں انسان بے وفا ہے اس کا انحصار فطرت کے متعلق شعور اور انسانی رویے پر ہے۔

ڈاکٹر اورنگزیب خان نے لکھا ہے:

> "زمین سب کا مشترکہ گھر ہے یعنی ہم انسانوں کا بھی اور دوسری تمام مخلوقات کا بھی۔ یہ موقف ایک سیکولر کبیری سماج کی خواہش سے عبارت ہے۔ ایک ایسا غیر طبقاتی سماج جس میں انسان، پرندے، جانور اور دوسری مخلوقات برابر کے شریک ہوں"۔[۱۸]

کہانی "بستی میں ہمیں بھی رہنے دو" میں تسنیم شریف نے ڈاکٹر اورنگزیب کے مندرج بالا اقتباس کی ایک طرح سے تشریح ہے کہ اس زمین پر انسان، پرندے، نباتات اور حیوانات سب کو جینے کا حق ہے۔ مگر انسان نے جنگلات کو برباد کر ڈالا۔ جانوروں کو چڑیا گھروں میں مقید کر دیا۔ شکار کے شوق کو پورا کرنے کے لیے ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ اگر پرندوں کو دیکھیں تو کہاں فضا کی وسعتیں اور کہاں اُڑان بھرنے کی صلاحیت رکھنے والی مخلوق کے لیے فقط ایک چھوٹا سا قفس، پھول تتلیاں جگنو سبھی انسانی ظلم کے ظلم کے خلاف نوحہ کناں ہیں۔ یہ کہانی جانوروں سے محبت اور ہمدردی کا درس بھی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہانی جانوروں پر ظلم کرنے والوں کی مذمت بھی کرتی ہے۔ یہ ایک بندر اور اس کے مالک کی کہانی ہے جو شدید گرمی میں صبح گھر سے نکلتے ہیں۔ مالک ڈگڈگی بجاتا ہے اور لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ بندر ناچتا جاتا ہے مگر کوئی ان کو اجرت نہیں دیتا۔ مالک اور بندر دونوں بھوکے تھے۔ اتنے میں ایک ریڑھی پر کیلے دیکھ کر بندر نے شور مچایا۔

"بندر کے شور مچانے پر مالک کو غصہ آگیا اور اس نے بندر کی پٹائی شروع کر دی۔ بندر رسی سے بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا"۔[19]

مالک کے تشدد کی وجہ سے لوگ جمع ہو گئے اور بندر پر ترس کھا کر پیسے دینے لگے۔ اس طرح مالک کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی۔ اب مالک کو پیسے کمانے کا ایک نیا دھندہ ہاتھ لگ گیا۔ جہاں بھی لوگوں کا ہجوم سا نظر آتا، وہ فوراً بندر کو مارنا شروع کر دیتا۔ بندر کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ پانچ دن تک مالک اسی طرح بندر پر تشدد کرتا رہا۔ رات کو مالک پیسے ملنے سے خوش ہو کر سکون سے سوتا اور زخمی بندر رات بھر سو نہ پاتا اور روتا رہتا۔ ایک رات بندر نے محسوس کیا کہ گلے میں بندھی رسی قدرے ڈھیلی ہے۔ اس نے گردن سے رسی نکالی اور دبے پاؤں وہاں سے بھاگ گیا۔ رات کا سناٹا تھا آخری بار بندر نے اُس گھر کو دیکھا جہاں سے محبت اب رخصت ہو چکی تھی بھاگتے بھاگتے وہ چڑیا گھر پہنچا۔ پہلے اس کو لگا کہ یہ جنگل ہے مگر پھر جب اس کو پتا چلا کہ سب جانور اور پرندے قید ہیں تو وہ چوری چھپے سب سے ملا اور اس حالت کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ سب آزادی چاہتے تھے اور ظالم انسانوں سے تنگ تھے۔ بندر نے معلوم کر لیا کہ چڑیا گھر کا عملہ چابیاں کہاں رکھتا ہے، اگلی رات اس نے پرندوں اور جانوروں کے پنجروں کے تالے کھول دیے۔ شیر کی قیادت میں چڑیا گھر کا یہ قافلہ مرکزی دروازہ عبور کر کے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ پیچھے پیچھے بھالو، بطخیں، بندر، زیبرے، گینڈے، کچھوے اور دیگر جانور آرہے تھے جب کہ مور، ابابیل، فاختائیں اور طوطے فضا میں گم ہو گئے۔

"کالی بطخ نے آخری بار مڑ کر چڑیا گھر کو دیکھا جہاں اس کے دو بچے فوت ہو گئے تھے۔ ہرن بھی خاموش تھے کہ جب یہ بچے تھے تو ان کے والدین بھی یہاں بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے"۔[20]

شہر والوں کو خبر نہ ہوئی کہ پرندے اور جانور سب انھیں چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ چڑیا گھر کے جانوروں نے راستے میں گائے بکریوں اور بھیڑوں کو ساتھ چلنے کی پیش کش کی مگر انھوں نے جواب دیا کہ انھیں انسان کے بچوں کا احساس ہے۔ اگر وہ چلے گئے تو بچے بھوکے مر جائیں گے ورنہ وہ بھی ساتھ چلتے۔ جانوروں کے یہ قافلہ چلتے چلتے جنگل پہنچ گیا اور سب جانور خوشی خوشی اچھلتے کودتے جنگل میں داخل ہو گئے۔ مگر مچھ اور کچھوے بھی سست روی سے چلتے چلتے منزل پر پہنچ ہی گئے۔ عہد جدید کے انسانوں کو فطرت سے دوری اور مشینوں سے ناطہ جوڑنے کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔ انسان کے لالچ اور حرص نے اس دنیا کو دوسری مخلوقات کا رہنا بھی دشوار بنا دیا ہے۔ دورِ حاضر کے انسان کو فطرت سے دوری اور مشینوں سے ناطہ جوڑنے کی بھاری قیمت ادا کرنی پرے گی۔

اس کہانی کے اختتام پر مصنفہ لکھتی ہیں:

> "یہ دنیا صرف انسانوں کی نہیں بلکہ پرندوں، حشرات اور جانوروں سب کی ہے۔ ان سب کے دم سے یہ دنیا نہ صرف حسین ہے بلکہ اس کا ماحولیاتی توازن بھی قائم ہے مگر ظالم انسان نے دوسری مخلوق کا یہاں رہنا مشکل بنا دیا ہے"۔[۲۱]

یہ ایک طویل کہانی ہے جو جانوروں پر انسانی ظلم کی داستان ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر جانوروں اور پرندوں سے ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بچے چڑیا گھر میں پرندوں اور جانوروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں مگر اس کہانی میں بچوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جانوروں کو قید کرنا ان پر ظلم ہے۔ آئندہ نسلوں کو سفاری پارکس قائم کرنے کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان وائلڈ لائف پارکس میں جانور قدرتی ماحول اور کھلے میدانوں میں آزاد گھومتے پھرتے ہیں اور لوگ ان کو دیکھ کر لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی کی وجوہات کے متعلق تو اب تک دنیا کے بہت سارے ممالک کے لوگ آشنا ہو گئے ہیں مگر ماحولیاتی آلودگی پر کیسے قابو پایا جائے، اس مسئلے کے حل کے لیے متعلقہ ماہرین اب بھی سر جوڑ بیٹھے ہیں اور آئے دن ان کی طرف سے مختلف آراء اور تجاویز سامنے آتی رہتی ہیں۔

۲۰۱۹ء میں چین کے صوبے وہان سے کرونا وائرس کا آغاز ہوا جنوری ۲۰۲۰ء کو عالمی ادارہ صحت نے اس بیماری کو عالمی وبا کا درجہ دے دیا کیوں کہ اس وبا نے دنیا بھر کے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لاکھوں لوگ اس وبا کا شکار ہو گئے۔ عالمی معیشت کو شدید نقصان ہوا اور تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ سیاحت بند ہو گئی، عبادت گاہیں ویران ہو گئیں اور سماجی رابطے ختم ہو گئے۔ اس وبا کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا کہ مادیت پرست لوگ اپنے رب اور روحانیت کی طرف متوجہ ہوئے۔ انسان ایک بار پھر فطرت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگا۔ اس وبا کے دوران ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے کے سلسلے میں ایک اہم حل بھی سامنے آیا یعنی مکمل لاک ڈاؤن ہو گیا۔ انسان کی نقل و حرکت محدود ہو گئی، گاڑیاں رک گئیں، کارخانے بند ہو گئے جس کے نتیجے میں فضائی آلودگی کم ہو گئی۔ چاند ستارے روشن نظر آنے لگے، پھولوں اور درختوں کے رنگ نکھر گئے، سڑک کے حادثات میں کمی آگئی اور یہ مشاہدہ بہت سے لوگوں نے کیا۔ اس سلسلے میں مصنفہ تسنیم جعفری نے کرونا وائرس کے تناظر میں کہانی "زمین پر اجنبی" لکھی ہے جس میں بچوں کے لیے ماحولیاتی آلودگی سے متعلق شعور پیدا کرنے اور آیندہ زندگی میں انھیں ایک ذمہ دار اور مہذب شہری بنانے کے لیے کرونا کے تناظر میں یہ دلچسپ کہانی تخلیق کی ہے جو بچوں کے لیے بے حد سبق آموز ہے۔

اس کہانی میں دو فرضی کردار ہیں۔ اس میں بھائی کا نام روشناس اور بہن کا نام روشنائے ہے۔ یہ زمین سے لاکھوں میل دور ایک سیارے کے باسی ہیں۔ روشناس اپنے سیارے میں بادلوں کے سائے میں بیٹھ کر زمین کو دیکھتا رہتا۔ وہ بچپن سے دیکھ رہا تھا اور بے چین رہتا تھا کہ سرسبز اور خوب صورت سیارے زمین کو انسان خراب کر رہا ہے۔ انسان کو شعور ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی زمین کو سنوار سکے۔ انسان انسان پر بھی ظلم کرتا ہے اور وہ پیسے کمانے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ اس نے اپنی بہن کو کہا کہ دنیا کی طرف دیکھو۔ مزدور سڑک کے کنارے بیٹھا ہے اور اس کو مزدوری نہیں مل رہی۔ اگر مل بھی جائے تو مزدور کی اجرت بہت کم ہوتی ہے۔ ٹریفک اور فیکٹریوں کے دھوئیں نے اس خوب صورت سیارے کو دھندلا کر دیا ہے یہ کملا گیا ہے۔ انسان گندگی پھیلاتا ہے تو اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ روشناس بہن سے کہتا ہے کہ مجھے دکھ ہے کہ ہم یہاں بیٹھ کر دور سے اس نیلے سیارے کو دیکھتے ہیں اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتے ہیں مگر اب یہ سیارہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ روشناس کو زمین پر آنے کا شوق تھا۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو ایک دن اپنی بہن سے اجازت لیتا ہے اور شہاب ثاقب پر بیٹھ کر چین میں اترتا ہے۔ چین کے ایک صوبے میں اترنے کے بعد روشناس (کروناوائرس) یہاں سے پوری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ وہ ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل ہوتا جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ بیمار ہوں تاکہ انھیں احساس ہو کہ گندگی پھیلانے اور صفائی میں لاپرواہی کی وجہ سے بیمار ہوتے ہیں۔ وہ لاپرواہی کتنی جان لیوا ہے اس کا احساس دلانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے انسان اس دنیا کا بھی خیال رکھیں۔

دنیا میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھونے لگے، فیکٹریاں، دکانیں، کاروبار سب بند ہو گئے۔ سڑکیں ویران ہو گئیں۔ نہ کارخانوں اور گاڑیوں کا دھواں خارج ہو رہا تھا نہ ٹریفک کا شور تھا۔ نہ پانی ضائع ہو رہا تھا نہ بجلی اور نہ ہی درخت کاٹے جا رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

> "فضا زہریلی گیسوں اور دھوئیں سے پاک ہو گئی۔ روٹھی ہوئی بارشیں واپس لوٹ آئیں۔ تمام درخت اور پودے دھل کر نکھر گئے اور پرندے خوشی کے گیت گنگنانے لگے۔ آسمان صدیوں بعد شفاف اور دھلا ہوا نظر آیا۔ سائنس دان بھی انگشت بہ دنداں تھے"۔[۲۲]

روشناس کی بہن نے پیغام بھیجا کہ روشناس واپس آجاؤ، تمھارے خلاف ویکسین تیار کی جا چکی ہے۔ لیکن روشناس نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ابھی اس کا کام مکمل نہیں ہوا۔ روشناس کی وجہ سے ساری دنیا روشناس ہو گئی کہ ماحولیاتی آلودگی پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے۔

دیکھا جائے تو کرونا کی وبا ایک قدرتی تجربہ تھا۔ ماحولیاتی اور موسمیاتی تبدیلیوں کا ذمہ دار انسان اور مشینی دور ہے جس کا مشاہدہ کیا گیا۔ اگر انسان کی نقل و حرکت اور مشینوں کو کچھ عرصے کے لیے روک دیا جائے تو دنیا صدیوں پیچھے

چلی جاتی ہے۔ بہر حال دنیا میں ماحول کے نقصان پر قابو پانے کے لیے بھی کوششیں کی جارہی ہیں جیسے گاڑیوں کو بتدریج پیٹرول اور ڈیزل کی بجائے الیکٹرک گاڑیوں میں منتقل کرنا وغیرہ۔

چھانگا مانگا جنگل میں آئے روز درخت کٹ جاتے ہیں اور چوری ہو جاتے ہیں۔ پرندوں اور جانوروں میں بے چینی اور تشویش پائی جاتی ہے۔ بلاشبہ درخت زمین کا حُسن ہیں اور موسموں کو اعتدال میں رکھتے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے کے لیے بھی جنگلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان درختوں سے عمارتی لکڑی، ایندھن کے طور پر جلائی جانے والی لکڑی اور طرح طرح کے پھل حاصل کرتا ہے۔ درختوں کا گھنا سایہ انسان اور جنگلی حیات کے لیے باعثِ راحت ہے اور پرندوں کا سب سے بڑا مسکن بھی ہے جہاں یہ اپنا آشیانہ بناتے ہیں اور کچھ شاخوں پر بیٹھ کر رات کو آرام کر لیتے ہیں درخت انھیں آندھی طوفان اور گرمی کی شدت سے محفوظ رکھتے ہیں درختوں پر موجود کیڑے مکوڑے اور پھلوں سے یہ پرندے اپنی غذائی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں ایسے میں اگر درخت تیزی سے کٹ رہے ہوں تو پرندوں اور جانوروں میں اضطراب پیدا ہو گا۔ سعید لخت کی کہانی چور کون میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے کہ درخت تیزی سے کٹ رہے ہیں اور جنگل میں موجود پرندے اور جانور ایک دوسرے پر درخت چوری کرنے کا الزام لگا رہے ہیں۔ سب چور کو ڈھونڈنے میں لگے ہوتے ہیں۔ کہانی میں آخر تک تجسس قائم رکھا گیا ہے جس سے بچوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے ۔ یہ کہانی فطرت کے متعلق شعور و آگاہی فراہم کرنے کے حوالے سے بہت اہم کاوش ہے۔ کہانی میں پاکستان کے چھانگا مانگا جنگل کا ذکر کیا گیا ہے جہاں ایک بوڑھا۔ عقل مند اور نیک الو رہتا تھا۔ جنگل میں بسنے والے جانور اور پرندے ہر مشکل میں الو سے مشورہ کرتے تھے۔ کہانی میں الو کو 'گرو جی' کہا گیا ہے۔ مصنف بیان کرتا ہے کہ مینا، ہاتھی، گائے اور دیگر جانور الو کی محفل میں بیٹھے ہیں اور لومڑی کی درخواست پر الو ایک کہانی سنا رہا ہے۔ الو کہتا ہے کہ ایک رات میں سو رہا تھا کہ اچانک فاختہ نے آکر مجھے جگایا اور بتایا کہ جنگل کے درخت باری باری کٹ رہے ہیں۔ اگر یہی حالت جاری رہی تو سارا جنگل کٹ کر ختم ہو جائے گا اور یہ علاقہ ایک میدان بن جائے گا۔ فاختہ الو کو دائیں بائیں دیکھ کر راز داری سے بتانے لگی:

> "یہ ساری شرارت اس کھٹ بڑھئی کی ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ کھٹ بڑھئی ایک موذی قوم ہے، یہ درختوں کو کھوکھلا کر کے گرا دیتے ہیں اور پھر اٹھا کر کہیں دور پھینک دیتے ہیں"۔[۲۳]

الو فاختہ کی بات سے اتفاق نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ کھٹ بڑھئی ایک چھوٹا سا پرندہ ہے۔ درختوں میں سوراخ کر کے کیڑے مکوڑے کھاتا ہے۔ اس سے درخت کو نقصان نہیں ہوتا۔ پھر چھوٹا سا پرندہ اتنے بڑے درخت کو کیسے اٹھا سکتا

ہے؟ اس پر فاختہ کہتی ہے کہ آپ یقین کریں نہ کریں، بتانا میرا کام تھا۔ الو نے فاختہ کی بات ماننے سے نکار کر دیا اور کہا کہ بغیر چھان بین کے کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔ الو نے کھٹ بڑھئی سے بات کی تو اس نے بتایا کہ وہ دن کو کام کرتا اور رات کو سو جاتا ہے، وہ ایک کمزور پرندہ ہے لہٰذا درختوں کو اٹھا نہیں سکتا۔ اس کے بعد کھٹ بڑھئی اور الو مل کر رات کو چور کی تلاش میں چوکیداری کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ طویل انتظار کے بعد رات کے پچھلے پہر اچانک پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آتی ہے اور ساتھ ہی چار آدمی ہاتھوں میں کلہاڑے اور رسیاں لے کر آتے ہیں اور ایک درخت کے پاس آکر رک جاتے ہیں۔ انھوں نے درخت کو کلہاڑے سے ضربیں لگائیں، آرے سے کاٹا اور درخت دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ انھوں نے درخت کی شاخیں کاٹیں اور اس کے ٹکڑے کر کے جنگل سے باہر لے گئے۔ اس کے بعد ایک بیل گاڑی میں درخت کو لاد کر وہاں سے چلے گئے۔ کھٹ بڑھئی نے الو کو بتایا کہ یہ سرکاری لکڑی کو چرا کر فروخت کر دیتے ہیں۔ الو اور کھٹ بڑھئی نے اسی وقت جانی کتے کو ساتھ لیا اور تھانے میں شکایت کرنے پہنچ گئے۔ پولیس نے ان کی شکایت پر ان چوروں کو گرفتار کر لیا۔

فطرت کے سبھی مظاہر کا انسان دشمن ہے۔ اس نے ندیوں سے لے کر سمندر تک کو آلودہ کیا، فضا کو آلودہ کیا، پھولوں اور باغوں کو تاراج کیا، تتلیوں اور جگنوؤں کو بے گھر کر دیا اور پرندوں اور جانوروں کی نسل کشی کی۔ اور آخر کار اس کہانی میں "درخت چور" بھی انسان ہی نکلا۔ اس کہانی میں ایک اخلاقی سبق یہ ہے کہ بغیر تصدیق اور چھان بین کے کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے یہ ایک جرم ہے اس طرح چوری کرنا بھی ایک جرم ہے۔ فاختہ نے بغیر تصدیق کے چوری کا الزام کھٹ بڑھی پر لگا دیا۔ اس کہانی میں مصنف نے بچوں کی کردار سازی پر توجہ دی انھوں نے فطرت کے ساتھ محبت اور انسان کے ہاتھوں فطرت کو نقصان پہنچانے کے حوالے سے انسان کے مکروہ کردار کو بے نقاب کیا ہے ساتھ ہی فطرت سے متعلق شعور و آگاہی بھی دی گئی ہے۔

آج سے بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے کہ دیہاتوں میں کھیتوں اور گھروں کے صحن میں روایتی چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اڑتے نظر آتے تھے۔ انسان کے قریب آنے پر یہ اجتماعی طور پر اُڑ جاتی ایسے میں ان کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز بھلی لگتی تھی۔ گھروں کے روشن دانوں، بالکونیوں اور درختوں پر چڑیاں بسیرا کرتیں اور صبح صبح ان کے چہچہانے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اب طرز تعمیر میں تبدیلی اور درختوں کی کٹائی یا کمی کی وجہ سے ان کی تعداد پہلے سے ساٹھ ستر فیصد کم ہو چکی ہے۔ شہری آبادی میں اضافہ، فضائی آلودگی، موبائل ٹاور کی برقی شعائیں اور موسمیاتی تبدیلیوں نے گھریلو چڑیا کو معدومیت کے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ انسان خود ہے جو زمینی اخلاقیات بھول گیا اور ماحولیاتی توازن کو برقرار نہ رکھ سکا۔ یہ پرندے قدرتی ماحول کے لیے بہت ضروری ہوتے

ہیں کیوں کہ یہ بیجوں کے پھیلاؤ میں مدد دیتے ہیں نیز فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کی آبادی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ پرندے دنیا کو قدرتی حُسن عطا کرتے ہیں۔ چڑیا کی حفاظت اور اس کی اہمیت کے پیش نظر ہر سال ۲۰ مارچ کو چڑیوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اس دن کو منانے کا آغاز انڈیا میں قائم سوسائٹیNature Foreverنے ۲۰۱۶ء میں کیا تھا۔ اب یہ دن پچاس ملکوں میں منایا جاتا ہے۔ رائل سوسائٹی فار دی پروڈکشن آف برڈز نے حال ہی میں گھریلو چڑیا کو اپنی ایڈ لسٹ میں ڈال دیا ہے۔ پاکستان میں سندھ کی ایک پرندوں کے تحفظ کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیم نے جب کراچی میں چڑیا شماری کرائی تو معلوم ہوا کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں چڑیوں کی تعداد ایک ہزار سے کم ہے۔ گھریلو چڑیا انسان سے مانوس ہونے والا پرندہ ہے یہ گھر کے صحن کی رونق اور بچوں کے لیے دلچسپی اور لطف کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کی نظموں اور کہانیوں میں چڑیا کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

پروفیسر مجیب ظفر کی لکھی ہوئی کہانی "اور چڑیاں اُڑ گئیں" میں بچوں کو چڑیا کی اہمیت اور اس کے دن بہ دن ختم ہونے کے بارے میں شعور و آگاہی دیتی ہے۔ مصنف بیان کرتا ہے کہ چڑیا نے میرے گھر کے روشن دان سے داخل ہو کر ٹیوب لائٹ پر گھونسلا بنالیا۔ اس میں مزید توسیع کرنے کے لیے وہ تنکے اور گھاس پھوس لے کر آتیں۔ میرے بچے روزانہ ان چار چڑیوں کے گھونسلے کو توڑ کر باہر پھینک دیتے کیوں کہ ان کو لگتا کہ اس سے ان کا کمرا گندا ہو رہا ہے۔ بچوں اور چڑیوں میں یہ مقابلہ کچھ دن جاری رہا، اس کے بعد ماں نے بچوں کو سمجھایا کہ:

> "دیکھو بچو! جیسے میں تمھاری ماں ہوں اسی طرح چڑیا بھی اپنے بچوں کی ماں ہے۔ اگر کوئی میرے بچوں کو پریشان کرے گا تو مجھے دکھ ہو گا، اور اگر کوئی تمھاری ماں کو پریشان کرے گا تو کیا تمھیں اچھا لگے گا؟"۔[۲۴]

ماں نے بچوں کو تلقین کی کہ چڑیوں کو اذیت مت دو، ان کے آشیانے کو نہ توڑو۔ یہ بس انتظار کر رہی ہیں کہ ان کے بچے اڑنے کے قابل ہو جائیں۔ پھر وہ فضاؤں میں اڑیں گے اور تمھیں اچھے لگیں گے۔ چند دنوں بعد ان چڑیوں کے نو نہال بڑے ہو گئے اور اپنی ماؤں کے ساتھ اڑ گئے۔ ماں نے بچوں کی طرف دیکھا اور کہا: "دیکھو بچوں چڑیا اُڑ گئیں"

کہانی "احساس" میں مصنف سید عثمان عبداللہ نے کچھ ایسی چڑیوں کا ذکر کیا ہے جو پنجرے میں قید تھیں۔

> "چھوٹی چھوٹی چڑیاں سنہری پنجرے میں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ صبح چریوں کی آواز سنی تو میں ان کے پاس چلا گیا۔ وہ آسمان پر آزاد پرندوں کو بہت دکھ اور بے چینی سے دیکھ رہی تھیں"۔[۲۵]

مصنف نے چڑیوں کا حال پوچھا تو چڑیوں نے جواب دیا کہ قید میں وہ بالکل خوش نہیں ہیں کیوں کہ قید میں اانسان اور پرندے ایک جیسے ہوتے ہیں جو بات آزاد فضا میں اڑنے میں ہوتی ہے وہ قید میں کہاں۔ مصنف نے چڑیوں کو بتایا کہ تم قید میں محفوظ بھی تو ہو اور بغیر محنت مشقت کے کھانا بھی ملتا ہے۔ یہ سن کر چڑیوں نے غصے سے جواب دیا کہ تم کاہل ہو اور خود اٹھ کر پانی بھی پینا پسند نہیں کرتے، اپنے والدین پر بوجھ بنے رہتے ہو۔ تمھیں محنت کی عظمت کا اندازہ نہیں ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ محنت کی ضرورت ہی کیا ہے جب سب کچھ میرے لیے دستیاب ہو۔ چڑیاں بولیں کہ یہ سب تم نے خود حاصل نہیں کیا بلکہ والدین یا کسی اور کے سہارے جی رہے ہو۔

"ہم چڑیوں کو دیکھو۔ جوں ہی اڑنا سیکھا، دانے دنکے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ والدین پر بوجھ نہیں بنے۔ پھر تنکا تنکا جمع کر کے آشیانہ بنایا۔ اگر آندھی یا طوفان آئیں اور گھر کو تباہ کریں تو ہم محنت سے دوسرا گھر تیار کرتے ہیں۔ تم محنت اور آزادی کے ثمرات سے واقف نہیں ہو"۔[۲۶]

اس مکالمے پر مصنف شرمندہ ہوا اور اسے احساس ہوا کہ ایک چھوٹی سی نازک مخلوق کو میں نے بلاوجہ پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے چڑیوں کو آزاد کر دیا اور چڑیاں آزاد فضاؤں میں اڑنے لگیں اور وہ اُن کو دور تک دیکھتا رہا۔ یہ کہانی فطرت سے متعلق شعور بیدار کرنے، فطرت سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے تخلیق کی گئی۔ اس میں اس چھوٹی سی مخلوق قیدی چڑیوں کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ قیدی انسان ہوں، پرندے ہوں یا جانور ہوں قید سب کے لیے تکلیف اور اذیت کا باعث ہے اور خاص کر فضاؤں میں اڑنے والے پرندوں کے لیے ان کو بلاوجہ قید کرنا ان پر ظلم ہے۔ اس کہانی میں اس ظالمانہ فعل کی مذمت کی گئی ہے اس روداد کو مصنف نے ایک عمدہ عنوان "احساس" کا نام دیا ہے

بچے فطرت پسند ہوتے ہیں اگر اُن میں پرندوں کی قید اور زیادتی کے بارے میں شعور اور احساس بیدار کیا جائے تو معصوم پرندوں کی خرید و فروخت کاروبار کرنے والے سفاک انسانوں کی تجارت کو کاری ضرب لگائی جاسکتی ہے۔

ایک مختصر پنجابی کہانی "پیار کا پنچھی" جو فرخندہ لودھی نے لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ سعدیہ سمن نے کیا ہے۔ چڑیا اور دیگر پرندے آندھی اور طوفان کی زد میں آتے ہیں کبھی ژالہ باری، کبھی شدید سردی یا شدید گرمی کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کبھی سنگ دل شکاری کی بندوق یا غلیل کا نشانہ بن جاتے ہیں یا پھر کسی گھر یا دکان میں قیدی بنا لیے جاتے ہیں۔ اس کہانی میں بچوں کی توجہ پرندوں پر ہونے والے ظلم کی طرف مبذول کروائی گئی ہے کہ ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور اپنا کاروبار چمکانے کے لیے لوگ ان کے پروں پر مختلف رنگ بھی لگاتے ہیں۔ مصنفہ بیان کرتی ہیں:

"بلال نے ایک دن ایک چڑیا کو پکڑا اور اس کے پروں پر رنگ کر دیا۔ پھر اس نے چڑیا کو چھوڑ دیا۔ جب وہ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس گئی تو ان سب نے اس کا اجنبی رنگ دیکھا اور اس سے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ وہ سب اس سے کہنے لگے کہ تم ہم میں سے نہیں ہو"۔[۲۷]

بلال ایک چودہ سالہ بچہ تھا۔ ایک دن وہ چڑیا گھر گیا تو اسے وہاں بہت سارے پرندے پسند آئے۔ وہ ایک چڑیا خریدنا چاہتا تھا مگر اس کے چچا نے اسے روکا اور بتایا کہ چڑیا گھر میں پرندے فروخت نہیں ہوتے۔ انھیں صرف چڑیا گھر میں ہی رکھا جاتا ہے تاکہ بچے انھیں دیکھ کر لطف اندوز ہوں۔ بلال کے گھر میں دو چڑیاں آتی تھیں۔ ایک دن اس نے ایک چڑیا کو پکڑ لیا اور اس کے پروں پر رنگ لگایا۔ جب چڑیا رنگ میں رنگی ہوئی اپنے ساتھیوں کے پاس گئی تو انھوں نے اس کو پہچاننے سے نکار کر دیا اور اجنبی سمجھ کر اس مارنے لگے۔ چڑیا زخمی ہو گئی اور واپس بلال کے کمرے کی کھڑکی میں آ کر بیٹھ گئی۔ بلال نے اسے پکڑ لیا اور پنجرے میں بند کر دیا۔ جب وہ اسکول جاتا تو چڑیا بھوکی پیاسی رہتی۔ وہ اداس رہنے لگی۔ ایک دن بلال جب صبح اٹھا تو اس نے دیکھا کہ چڑیا پنجرے میں مری پڑی ہے۔ بلال ایک اچھا مصور تھا، اس نے چڑیا کی تصویر بنائی۔ جب شہر میں تصویروں کی نمائش ہوئی تو لوگوں نے بلال کی تصویر کو خوب سراہا۔ جب لوگ بلال کی مصوری کی تعریف کرتے تو اسے چڑیا یاد آ جاتی اور اسے لگتا جیسے چڑیا کھڑکی پر بیٹھی کہہ رہی ہو: ''میں اس لیے مری تھی کہ تم میری تصاویر بناؤ مجھے یاد کرو کہ لوگ تمھیں یاد رکھیں، تمھیں پیار کریں اور کہیں: پیار کا پنچھی، پیار کا پنچھی، پیار کا پنچھی'' فرخندہ لودھی نے بچوں کو احسن طریقے سے پرندوں کی اس فطرت سے متعلق آگاہ کیا ہے کہ اگر پرندوں کے پروں پر مصنوعی رنگ لگا دیا جائے تو وہ ساتھی پرندوں میں اجنبی ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھی پرندے مار مار کر اسے لہولہان کر دیتے ہیں یہ پرندوں کی فطرت سے متعلق ایک ایسا نالج ہے جس سے بچے واقف نہیں ہوتے بلال کی لاعلمی کی وجہ سے ایک معصوم چڑیا زندگی کی بازی ہار جاتی ہے اس کہانی کے مطالعے سے چڑیا اور دیگر پرندوں سے ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

حسن ذکی کاظمی نے کہانی "مضبوط رشتہ" تحریر کی جس میں ایک بزرگ انسان، ایک بوڑھے درخت اور اس درخت پر بسیرا کرنے والے پرندوں کے درمیان فطری تعلق محبت اور ہمدردی کے جذبے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف نے پرندوں کے شب و روز کا تذکرہ بہت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ایک درخت انسان اور پرندوں کے لیے کتنا اہم ہے نیز ایک مہذب اور فطرت پسند انسان کا فطرت کے ساتھ رویہ جیسے اہم نکات کے متعلق اس کہانی میں شعور و آگاہی فراہم کی گئی ہے۔

کہانی کے مطابق ایک گاؤں کے قریب ایک گھنا، بلند و بالا، اور قدیم درخت تھا۔ اس درخت کی وجہ سے اس گاؤں کا نام 'پیڑ والی بستی' پڑ گیا تھا۔ اس درخت پر طرح طرح کے خوش نما پرندے آکر بیٹھتے۔ چڑیا، مینائیں، طوطے اور فاختاؤں نے یہاں بسیرا کر رکھا تھا ہُدہُد کا جوڑا بھی اس درخت پر لطف اندوز ہونے کے لیے آتا سارے پرندے حضرت سلمان علیہ السلام کا درباری ہونے کیے ناطے ان کی خوب عزت افزائی کرتے۔ یہ پرندے ایک خاص نظم و ضبط کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔ وہ صبح صبح رزق کی تلاش میں اڑان بھرتے اور شام کو سب ایک غول کی صورت میں واپس درخت پر آجاتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ کہانی میں مصنف بیان کرتا ہے:

> "تھوڑی دیر تک ان کی آپس میں بیٹھک جاری رہتی۔ ایک دوجے کو اپنے دکھڑے سناتے، دن بھر کی کہانی سناتے، اپنے تجربات بیان کرتے، ایک دوسرے کو رزق کے مختلف ٹھکانوں سے آگاہ کرتے اور شکاری کی گولی اور بڑے ظالم پرندوں سے بچنے کے طریقوں پر غور کیا جاتا"۔[۲۸]

اس کے بعد پرندے اللہ کا شکر ادا کرتے کہ انھیں اس نے رزق دیا، خطروں سے بچایا اور وہ خیریت سے واپس لوٹ آئے۔ پرندوں کے چہچہانے کا شور آہستہ آہستہ کم ہو جاتا اور وہ سو جاتے۔ اس قدیم درخت کے سائے تلے لکڑی کی ایک پرانی اور لمبی سی بنچ پڑی تھی جس پر 'میاں جی' نامی گاؤں کے ایک بزرگ شخص آکر بیٹھ جاتے۔ وہ اس قدیم درخت کے سائے میں بیٹھ کر پرندوں کی آوازیں سنتے پرندوں کی خوب صورت آوازیں میاں جی کے کانوں میں رس گھولتیں اور ان کے لیے گھر سے دانہ دنکا بھی لے آتے۔ پرندے بھی میاں جی سے بہت مانوس تھے اور دانہ چگ کر درخت پہ بیٹھ جاتے اور میاں جی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے۔ فطرت کا یہ حَسین بندھن وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہو گیا تھا۔ پرندے اور میاں جی اس بوڑھے درخت سے پیار کرتے تھے۔ وہ درخت بہت قدیم تھا۔ میاں جی بچپن میں اس درخت کے نیچے کھیلتے تھے اور اس کی شاخوں پر جھولتے تھے۔ اسکول کے زمانے میں سبق اسی درخت کے ٹھنڈے سائے تلے بیٹھ کر یاد کرتے تھے۔ یک دن علاقے کے بڑے زمیندار نے اس درخت کو کاٹنے کے لیے اپنے کارندے بھیجے۔ میاں جی فوراً مزاحم ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ درخت بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کو کاٹنا ضروری ہے۔ میاں جی جواب دیا کہ میں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں، اب کیا مجھے بھی مار ڈالو گے؟ اس پر زمیندار کے کارندے بد تمیزی کرنے لگے۔ اتنے میں پرندوں کی احتجاجی آوازیں بھی بلند ہو گئیں۔ اسی دوران گاؤں کے کچھ جوشیلے اور بہادر نوجوان میاں جی کی مدد کو پہنچ گئے۔ زمیندار کے کارندے ان کو دیکھ کر واپس چلے گئے اور اس طرح درخت کٹنے سے بچ گیا اور پرندے بھی بے گھر ہونے سے بچ گئے۔ انھی دنوں میاں جی کے ہمسائے کے گھر آگ لگ گئی مگر معجزانہ طور پر میاں جی کا گھر پرندوں کی دعا کی وجہ سے بچ گیا۔

حسن ذکی نے پرندوں کی روز مرہ زندگی کے معمولات کو عمدہ پیرائے میں تحریر کیا کہ پرندے صبح سویرے اپنے آشیانے کو چھوڑ دیتے ہیں اور محنت سے اپنا رزق تلاش کرتے ہیں اور وقت پر سب مل کر واپس ضیف درخت پر آکر بیٹھ جاتے ہیں دن بھر کے اپنے اپنے تجربات اور خطرات سے متعلق ایک دوسرے کو آگاہ کرتے ہیں اور پھر یہ تھک ہار کر آرام کرتے ہیں اور نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں پرندوں کا صبح سویرے اٹھنا دن بھر محنت کرنا اور شام ہوتے ہی وقت پر اپنے آشیانے پر لوٹ آنا ان کے معمول سے بچوں کو زندگی گزارنے کا سبق ملتا ہے۔ ولیم وڈرز ورتھ، علامہ اقبال اور کولرج جیسے فطرت پسند شاعر فطرت کو ایک معلم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ نیز خوب صورت پرندوں کے سریلے گیت اور آوازیں گھنے بوڑھے درخت کا سایہ بچوں کو فطرت سے محبت کی ترغیب دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بوڑھا درخت فطرت پسند میاں جی کی تنہائی کا ساتھی ہے۔ درخت کا سایہ راحت بخش ہے اور یہ درخت میاں جی اور پرندوں کے تعلق کا ذریعہ اور سبب ہے۔ یہ کہانی ظاہر کرتی ہے کہ درخت فطرت اور انسان کو جوڑے رکھتے ہیں۔ درخت نہ ہوں تو رنگ برنگے پرندے بھی نہیں ہوں گے۔ مصنف نے اس کہانی میں پرندوں کے احساسات و جذبات کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس کہانی میں فطرت کے اس حسین مظہر یعنی درخت کو طاقت ور اور سرمایہ دار لوگوں سے خطرہ ہونا بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ طاقت ور لوگ فطرت کو اپنے مقاصد کے استعمال کرتے ہیں اور اس ہونے والے نقصان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بہر کیف اس کہانی میں انسان اور فطرت کے مضبوط رشتے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

معظمہ تنویر نے ایک طوطے کی کہانی "بہزاد بھائی کا طوطا" تحریر کی ہے جس کو بہزاد نامی لڑکے نے اس وقت بچایا تھا جب اس پر بہت سے کوے ٹوٹ پڑے تھے۔ بہزاد اور اس کے گھر والوں نے طوطے کو پالا ، اس کا نام 'میاں مٹھو' رکھا اور اس کو بولنا بھی سکھایا۔ طوطے کو اردو کے علاوہ سات اور زبانوں کے الفاظ بھی سکھائے گئے۔ بچوں کی ٹولیاں روز اسے دیکھنے آتیں اور سب اس کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہوتے یہاں تک کہ طوطے کی تصویر اخبار میں بھی شائع ہوئی۔ کچھ دنوں بعد بہزاد نے دیکھا کہ طوطا پنجرے میں اداس بیٹھا ہے۔ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا اور بیمار سا لگنے لگا تھا۔ وہ ہر وقت آنکھیں بند کر کے غور و فکر کرتا رہتا۔ بہزاد نے جب اپنے والدین سے طوطے کی حالت کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ طوطا قید سے پریشان ہے۔ اس کو آزاد کر دو، یہی اس کے لیے بہتر ہے۔ بہزاد طوطے کو خود سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کچھ عرصے تک ماں باپ کی بات پر غور کیا تو اس کو سمجھ آگئی کہ پرندوں کو اللہ نے پر اس لیے دیے ہیں تاکہ یہ فضاؤں میں اڑ سکیں۔ ان کی آزادی کو سلب کرنا ان کے ساتھ زیادتی

ہے اور اگر ہم ان سے پیار کرتے ہیں تو ہمیں ان کو آزاد کر دینا چاہیے۔ یہ سوچ کر بہزاد نے طوطے کو آزاد کر دیا اور اپنے ماں باپ کو بتانے لگا کہ:

"میرا دوست میاں مٹھو بہت مسرور تھا۔ اس نے فضا میں لمبا چکر لگایا۔ وہ دوسرے پرندوں سے مل رہا تھا اور پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا بہزاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے"۔[۲۹]

اس کہانی میں مصنفہ نے بچوں میں فطرت سے محبت کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ طوطا ایک سماجی پرندہ ہے وہ گھروں میں موجود درختوں میں انسان کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے اس میں بچوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ پرندوں سے محبت ہونی چاہیے پرندوں سے محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو قید و بند میں رکھا جائے بلکہ ان سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان پرندوں کے لیے فطری ماحول اور صاف فضا مہیا کرے۔ اُن کے لیے پانی کا بندوبست کرے۔ اس کے علاوہ پرندوں کا مسکن یعنی جنگل کی افزائش کے لیے کوشش کرے۔ پھر ہی وہ گھروں کی منڈیروں پر بیٹھیں گے شاخوں پر جھولیں گے اور اُن کی خوبصورت آوازیں کانوں میں رس گھولیں گی۔ پرندوں یا فطرت سے محبت کرنے کا یہ ایک بہت مثبت طریقہ اور پہلو ہے جو اس کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔

نعمان فاروق کی کہانی "نادان کوّا" ایک شرارتی کوے کے متعلق ہے جو دانش اور دانیال نامی دو بھائیوں کی گلی میں اپنی مادہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے دونوں بھائیوں کے گھر قریب گھونسلا بنایا تھا اور روز ان کی چھت پر سے اس کو دانہ اور پانی ملتا تھا۔ دراصل دانش اور دانیال اپنے گھر کی چھت پر پرندوں کے لیے دانہ اور پانی رکھتے تھے۔ کوا بہت شرارتی تھا۔ وہ دوسرے پرندوں اور گلی سے گزرنے والے بچوں کو چونچ مار کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ مادہ اس کو سمجھاتی رہتی کہ جن کی چھت سے دانہ پانی لیتے ہو انھی کو چونچ مارنا اچھی بات نہیں ہے لیکن کوا نہ سنتا۔ ایک دن دانیال نے غلیل سے کوے کو ڈرانے کا منصوبہ بنایا مگر دانش نے اسے روکا کہ کوے کو پتھر لگ بھی سکتا ہے۔ اسی طرح ایک دن مادہ نے کوے کو انڈوں پر بیٹھنے کا کہا اور خود کچھ کھانے کو لانے چلی گئی۔ کوا انڈوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اسے دانش گلی سے جاتا دکھائی دیا۔ اس نے ٹنڈ کروائی ہوئی تھی اور کوے کو اوپر سے اس کا سر چمکتا نظر آیا۔ کوے کو شرارت سوجھی اور اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہ انڈوں چھوڑ کر اڑا اور دانش کے سر پر چونچ ماری۔ جب وہ واپس آیا تو ایک گلہری اس کے انڈوں کے پاس آ گئی تھی۔ دونوں کی ہاتھا پائی میں انڈے نیچے گر کر ٹوٹ گئے اور اتنے میں مادہ وہاں آ پہنچی۔ مادہ کو کوے پر بہت غصہ آیا اور اس نے کہا:

"دیکھو! غلط کام کسی کے ساتھ بھی کرو وہ غلط ہے۔ لیکن تم نے اپنے محسنوں کو تنگ کیا۔ اسی لیے قدرت نے انتقام لینے میں نہیں لگائی جاؤ اب اکیلے رہو میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھر سے اڑ گئی اور نادان کوا اکیلا رہ گیا۔ [۳۰]

یہ ایک سبق آموز کہانی ہے جس میں فطرت کو استاد کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اس میں کوّے کے برے کام کا نتیجہ سامنے آیا اور اس کہانی کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ دوسروں کو خواہ مخواہ تکلیف دینے والا بے وقوف ہوتا ہے اور خود ہی نقصان اٹھاتا ہے۔ اس کہانی میں بچوں کو فطرت سے سبق حاصل کرنے کا شعور اور اخلاقی سبق بھی دیا گیا ہے۔

"ناشکرا کوّا" ایک سبق آموز کہانی ہے جس میں خلیل جبار ایک ایسے کوّے کا ذکر ہے جو اپنی ظاہری بناوٹ اور شکل و صورت سے نالاں ہے۔ وہ مور اور دوسرے پرندوں کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے اور اسے اپنے رنگ کے بارے میں ہمیشہ شکایت رہتی ہے۔ کوّا حاسد اور ناشکرا تھا۔ ایک دن کوے کے گھونسلے کے پاس مور کا ایک جوڑا آ کر رہنے لگا۔ کوّے نے جب مور کے خوب صورت رنگ دیکھے تو اپنی ماں سے اپنے سر تا پا کالا ہونے کی شکایت کی۔ ماں نے سمجھایا کہ اللہ نے کس کو کیسا بنایا اور کیوں بنایا یہ وہی بہتر جانتا ہے۔ اگر اس نے ہمیں مور کی طرح خوب صورت نہیں بنایا ہے تو ہم تکبر سے بچے ہوئے ہیں۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کوّا خاموش ہو گیا مگر وہ ماں کی باتوں سے مطمئن نہیں تھا اور وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا ایک دن اس نے دیکھا کہ دونوں مور ایک جگہ دانہ چگ رہے تھے۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اتنے میں کچھ شکاریوں نے جال پھینکا اور دونوں موروں کے ساتھ وہ بھی جال میں پھنس گیا۔ تینوں جال سے نکلنے کے لیے پر مارنے لگے مگر نکل نہ پائے۔ کوّا بہت پریشان ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد شکاریوں نے جال میں کوّا دیکھا اور اس کو نکال کر آزاد کر دیا تھر تھر کانپتے ہوئے کوّے کو شکاری نے غصے سے کہا کہ:

"کمبخت تمہیں تو کوئی مفت میں بھی نہیں خریدے گا تم جال میں کہاں سے آ گئے یہ کہہ کر شکاری نے کوے کو آزاد کر دیا کوّا بے حد خوش ہوا کہ وہ جس بدصورتی کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار تھا اسی بدصورتی نے اسے قیدی ہونے سے بچا لیا اور اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کو مور نہیں بنایا گیا ورنہ وہ آج شکاریوں کی قید میں چلا جاتا اس کے بعد اس نے کبھی اپنی شکل و صورت پر ناشکری نہیں کی۔" [۳۱]

یہ کہانی شکر ادا کرنے کا سبق دیتی ہے اور اس میں فطرت کو استاد کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہ کہانی بچوں کو سکھاتی ہے کہ اگر ہمارے اندر کوئی چیز ہماری خواہش کے مطابق نہیں بھی ہے تو ہمیں اس پر نالاں نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ ہر کام کے پیچھے ایک مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ اس کہانی میں قدرت کی طرف مثبت رویہ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے نیز بچوں کو فطرت سے سبق حاصل کرنے کو شعور دیا گیا ہے۔

کوّا ایک شرارتی پرندہ ہے۔ دوسروں کو تنگ کرتا ہے اور بچوں کے ہاتھ سے نوالہ چھین لیتا ہے ۔ کوے کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا اور وہ لالچی اور جلد باز ہوتا ہے۔ نادان کوے کی کہانی میں نعمان بشیر نے بچوں کو شرارتوں اور دوسروں کو تنگ کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی ہے اور ہر حال میں اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے کی ترغیب دی ہے جب کہ ناشکرے کوے کی کہانی میں مصنف نے بچوں کو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے کا سبق دیا ہے۔ انھوں نے بچوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ کوے کی طرح حسد نہ کریں اور نہ ہی احساس کمتری کا شکار ہوں بلکہ خدا کی دی گئی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے آگے بڑھیں اور اپنے حصے کا کام کریں

دیہاتوں میں عموماً مرغیاں پالی جاتی ہیں۔ مرغیاں انڈوں پر ایک خاص مدت کے لیے بیٹھتی ہیں اور ان میں سے چھوٹے چھوٹے چوزے نکل آتے ہیں جو خوبصورت اور بہت نازک ہوتے ہیں۔ مرغی چوزوں کو اپنے پروں میں چھپا کر رکھتی ہے اور انھیں سرد و گرم سے بچاتی ہے۔ چوزے مرغی کے ساتھ رہتے ہیں اور جب مرغی کو کہیں دانے نظر آتے ہیں تو وہ اپنی مخصوص آواز کے ذریعے بچوں کو بلاتی ہے اور بچے دوڑے دوڑے چلے آتے ہیں۔ چوزوں کو ماں کا پیار خوب میسر آتا ہے۔ اور مرغا بھی چوزوں کا خیال رکھتا ہے۔ کہانی "سگی ماں" میں الیاس گھمن (مترجم: منزہ) نے بچوں کی توجہ اُن چوزوں کی طرف دلائی ہے جن کی ماں نہیں ہوتی۔

> "چھوٹے چھوٹے بہت سارے چوزے لوہے کی مشین کے اتنے پاس کھڑے چوں چوں کر رہے تھے، چوزوں کو سخت سردی لگ رہی تھی دوسرے چوزوں کو سخت سردی لگ رہی تھی دوسرے چوزوں کو مائیں پروں کے نیچے چھپا کر سردی سے بچا رہی تھی ہماری ماں ایسا کیوں نہیں کر رہی چوں چوں ہماری ماں کہاں ہے یہ مشین ہماری ماں نہیں ہے"۔[۳۲]

مصنف نے جدید مشینی دور کے ایسے چوزوں کا ذکر کیا ہے جو مرغی کی جگہ مشین کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی اس ترقی نے جہاں انسان کے لیے فائدے اور آسانیاں پیدا کی ہیں وہاں بے حسی بھی بڑھ گئی ہے۔ مشینی چوزے بھی سرد و گرم کو ایسے ہی محسوس کرتے ہیں جیسے مرغی کے چوزے کرتے ہیں مگر مشینی چوزوں کا دکھ کون سمجھے جن کو ماں کے پر اور پیار دونوں میسر نہیں۔ مشین ان کی ماں ہے جس کو ان کے احساسات اور درد کی کوئی پرواہ نہیں۔ وہ

سردی سے ٹھٹھر رہے ہوں، دھوپ میں جل رہے ہوں، بارش میں بھیگ رہے ہوں یا بھوک سے نڈھال ہو رہے ہوں، مشین کو کیا احساس ہو گا۔ مشینی چوزوں سے پولٹری فارم والے شاہد محبت کرتے ہیں مگر اپنے کاروبار کے حوالے سے۔ یہ دنیا کا نظام ہے کہ بعض اوقات انسان کے بچے بھی انھی چوزوں کی طرح والدین کی شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں عزیز و اقارب اور رشتہ دار ایسے بچوں کا جتنا بھی خیال رکھیں والدین کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔

اس کہانی میں قدرتی نظام کو چھوڑ کر مصنوعی نظام کو اختیار کرنے کی وجہ سے جانداروں اور فطرت پر پڑنے والے اثرات کو بیان کیا گیا ہے اور بچوں میں فطرت سے ہمدردی اور احساس پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک اچھوتا موضوع ہے اور "ماں کا گیت" مصنف کے گہرے مشاہدے اور عمیق احساس کا مظہر ہے۔

سہ ماہی ادبیات اطفال میں پھولوں سے متعلق بچوں میں شعور و آگاہی پیدا کرنے اور بچوں کو فطرت کے قریب کرنے کے حوالے سے کئی ایک عمدہ کہانیاں موجود ہیں جن میں عام طور پر بچوں کو پھول نہ توڑنے اور ان کی حفاظت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ بچے فطرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ پھولوں اور تتلیوں سے محبت کرتے ہیں۔ آگے چل کر چند پھولوں کے متعلق تحریر کردہ کہانیوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

دنیا بھر میں پھولوں کی تقریباً اڑھائی سے چار لاکھ اقسام پائی جاتی ہیں۔ پاکستان میں پانچ ہزار سات سو کے قریب پھولوں کی اقسام ہیں۔ پھولوں کی اقسام کی طرح ان کے رنگ بھی ان گنت ہوتے ہیں اور ان کی محسور کن خوشبو بھی الگ الگ نوعیت کی ہوتی ہے۔ پھول دنیا کا جمالیاتی حُسن ہیں۔ پھول فضاؤں کو معطر کرتے ہیں اور اتنے دل کش اور پر کشش ہوتے ہیں کہ جگنو، تتلیوں اور انسانوں کو ایک جگہ لا کھڑا کرتے ہیں پھول ماحولیاتی توازن کا سبب ہیں۔ فطرت کے دیگر عناصر کی طرح ماحولیاتی اور موسمی تبدیلیاں پھولوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی آف کیمبرج کے ریسرچر الف۔ بنتجن (Ulf Buntgen) ۲۰۲۲ کی ایک ریسرچ کے مطابق درجہ حرارت میں تبدیلی کی وجہ سے پھولوں کی افزائش اور ماحولیاتی توازن متاثر ہو رہا ہے۔ برطانیہ میں وقت سے پہلے پھول کھلنا شروع ہو گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے پھولوں کے کھلنے کے اوقات تبدیل ہو رہے ہیں۔ موسم بہار جلدی شروع ہو کر جلد ہی ختم ہونے لگا ہے۔ بارشوں کے نظام میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔ درجہ حرارت میں اضافے کی وجہ سے شہد کی مکھیوں اور تتلیوں کی پھولوں سے ہم آہنگی کم ہو رہی ہے جس سے پھولوں کی افزائش متاثر ہو رہی ہے۔ پھول ایک خاص درجہ حرارت میں ہی نشو و نما پا سکتے ہیں۔ پاکستان میں بھی جوں جوں بہار کا دورانیہ کم ہوتا جا رہا ہے، پھول وقت سے پہلے کھلتے اور جلد مرجھاتے جا رہے ہیں۔

اس طرح Earth.com میں Eric Ralls کی تحقیقی رپورٹ جو اگست ۲۰۲۴ء میں شائع ہوئی کے مطابق ڈونیانا نیشنل پارک اسپین میں ۲۲ دن پہلے، جنوبی اسپین میں دو ماہ پہلے اور کچھ اقسام کے پھول ۹۲ دن پہلے کھل گئے۔ ایسی ہی تبدیلیاں امریکہ کی ۴۸ ریاستوں میں بھی دیکھنے کو ملی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض حشرات یعنی تتلیاں اور شہد کی مکھیاں وغیرہ اپنے قدرتی اوقات کار سے ہٹ کر سرگرم عمل ہیں جس کے سبب مختلف پھولوں کی Pollination کے عمل میں خلل پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح ماحولیاتی توازن بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔

ماہِ کائنات کی کہانی "کالا گلاب "ایک لڑکی اور گلاب کے پھول کے بارے میں ہے۔ اس میں ایک لڑکی سحر ش ہے جس کو پھول اُگانے اور پودے لگانے کا بہت شوق ہے۔ اس کی بہنیں مہوش اور ثانیہ پھولوں کو توڑتی تھیں جس سے سحر ش کو بہت دکھ ہوتا۔ وہ ایک فطرت پسند لڑکی تھی۔ سحر ش نے والدہ کو شکایت کی اور کہا پھول کیاریوں میں کھلے ہوئے اچھے لگتے ہیں اس کے جواب میں مہوش طنزیہ انداز میں کہتی ہے کہ پھول زلفوں میں سجانے کے اچھے ہوتے ہیں۔ ایک دن سحر ش کے والد نے ایک کالے گلاب کا پودا لایا جو اس نے صحن میں موجود پھولوں کی کیاری میں لگایا۔ وہ پودے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ ایک صبح اس نے دیکھا کہ ایک کالے رنگ کا گلاب اس پودے کی ٹہنی پر کھل گیا ہے۔ یہ دیکھ کر سحر ش بہت خوش ہو گئی۔ اتنے میں مہوش پھول توڑنے پہنچ گئی مگر جوں ہی پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا، ایک شہد کی مکھی آئی اور اس کے ہاتھ میں زور سے کاٹ لیا۔ مہوش رونے لگی اور آئندہ پھول نہ توڑنے کا وعدہ کیا۔ اس کہانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہوش نے پھول توڑنے کی کوشش کی یعنی فطرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو فطرت نے شہد کی مکھی کی صورت میں مہوش کو سزا دی۔ اس طرح بچوں کو فطرت کو نقصان پہنچانے سے باز رہنے کا سبق دیا گیا ہے۔ انسان اپنے معاشی فائدے، کاروبار اور سماجی رسم و رواج کے لیے پھولوں بے دریغ توڑتے ہیں۔ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے پھولوں کی پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے، ایسے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ پھولوں کی افزائش اور آبیاری پر عالمی سطح پر توجہ دی جائے تاکہ ماحولیاتی توازن قائم رہے۔ موسمیاتی تبدیلیوں کے پیشِ نظر فرزانہ روحی اسلم نے کہانی "پھول بچ گیا" تحریر کی۔

زمین سخت تھی، زمین کو نرم نہیں کیا گیا تھا۔ پانی کی کمی تھی مگر پھول کا پودا سخت زمین کا سینہ چاک کر کے سطح پر ابھر آیا تھا اس پودے کے نازک پتے دائیں بائیں سر اٹھا کر حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ دن کو پانی کی کمی کی وجہ سے پیاسے ہوتے، رات کو شبنم کے قطروں کو اپنے اندر جذب کر لیتے۔ ان مشکل اور ناسازگار حالات میں بھی اس پھول پر ایک کلی مسکرائی اور چند دنوں بعد پھول بن گئی۔ شدید گرمی پھولوں کی حالت غیر ہو جاتی۔ اس کی نازک پنکھڑیاں گرمی کی شدت سے چرمرا جاتیں۔ پتے ہانپنے لگتے۔ شام کو جب ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی، پھول کی جان میں جان آتی۔

دوپہر کو جب سورج آگ برسا رہا تھا، پھول نے چڑیا سے اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے کہا کہ کاش میں کسی درخت کے سائے میں ہوتا تو گرمی سے بچ جاتا۔ چڑیا نے پھول کو بتایا کہ اگر تم کسی درخت کے نیچے ہوتے تو درخت تمھارے حصے کا سارا پانی ہضم کر جاتا۔ درخت کے سائے تلے بیٹھنے کے لیے لوگ آتے اور تمھیں نقصان پہنچاتے۔ پھول تو ایک جگہ بیٹھ کر آکسیجن حاصل کر لیتے ہیں۔ چڑیا نے کہا کہ مجھے دیکھو، سارا دن محنت کر کے دانہ دنکا تلاش کرتی ہوں اور بچوں کا پیٹ پالتی ہوں۔ چڑیا نے پھول کو تسلی دی کہ جس حال میں بھی ہو بہادروں کی طرح جیتی رہو۔ شام کو موسم بہتر ہوا اور ٹھنڈی ہوا چلی تو پھول اپنی شاخوں پر لہلہانے لگا۔ پاس سے گزرنے والے بچے نے پھول توڑنا چاہا۔ ماں کے منع کرنے پر بچے نے کہا:

> ؎"یہ کہاں لکھا ہے کہ پھول توڑنا منع ہے؟" ماں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا: "لکھا تو کہیں نہیں ہے مگر پھول شاخ سے نہیں توڑنا چاہیے۔ تم میرے گلشن ہو اور کوئی مجھ سے تمھارا ہاتھ چھڑا کر لے جائے تو ایک ماں کو کتنا صدمہ ہوگا" یہ سن کر صالح بچے نے پھول نہیں توڑا۔ ڈرا سہا پھول سمجھ گیا کہ بچہ خدا حافظ کہہ رہا ہے۔ وہ دن بھر کی اذیت بھول کر پھر سے لہلہانے لگا۔ اس طرح ایک پھول بچ گیا۔"[۳۳]

اس کہانی میں فطرت سے سیکھنے کے حوالے سے بچوں کے پاس بہت کچھ ہے۔ اس میں فطرت کے متعلق آگاہی اور فطرت کو لاحق خطرات کا تذکرہ بھی ہے۔ یوں تو پھولوں کی افزائش کے لیے سخت زمین کو نرم کیا جاتا ہے، پودوں کو پانی دیا جاتا ہے اور انھیں گرمی سردی اور پھول توڑنے والوں سے محفوظ رکھا جاتا ہے مگر اس کہانی میں ایک ایسے پھول کا ذکر ہے جو سخت زمین ہونے کے باوجود اگ آیا ہے۔ شدید گرمی اور پانی کی کمی کے باوجود وہ پھول کھل گیا ہے اور خواہش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کو گرمی سے کسی درخت کے سائے کی پناہ ملے۔ اس کہانی میں مصنفہ نے ایک تو بیج سے پھول کھلنے تک کے سفر سے بچوں کو روشناس کروایا ہے اور دوسرا انھیں مشکل حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنے اور آگے بڑھ کر منزل کو پا لینے کا سبق دیا ہے۔ کسی کے سہارے زندگی نہیں گزارنی چاہیے جیسا کہ پھول نے درخت کا سہارا لینے کی خواہش کی تو چڑیا نے خبردار کیا کہ درخت تمھارے حصے کا سارا پانی پی جائے گا۔ یعنی دوسروں کا سہارا لے کر زندگی گزارنا رسوائی کا سبب ہے۔ فطرت کے حوالے سے اس کہانی میں ایک اہم بات یہ آئی ہے کہ بچوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ فطرت کو نقصان پہنچانا غلط بات ہے اور یہ باور کرانے کے لیے انسانی جذبات کی مثال دی گئی ہے کہ اگر کوئی کسی انسان کو تکلیف پہنچائے تو یہ جتنا غلط ہوگا اتنا ہی یہ بھی غلط ہے کہ انسان فطرت کو نقصان پہنچائے۔ اس کہانی بچوں میں فطرت کا احساس، قدرت کے نظام کی اہمیت اور فطرت سے متعلق شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وفا سعادت کی کہانی "پھولوں کی رانی" میں ایک بچی مہک اپنے پھول جمع کرنے کے شوق کی تسکین کے لیے ایک باغ میں چلی آئی۔ باغ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ مہک کے اسکول میں مینا بازار تھا۔ وہ باغ کے مالی کی بیوی سے درخواست کرنے آئی کہ میں پھولوں کی رانی بنوں گی۔ مجھے پھول توڑنے کی اجازت دیں۔ مالی کی بیوی کی اجازت پر مہک اور اس کی سہیلیاں دوڑتی ہوئی باغ میں آ گئیں اور پھول توڑ توڑ کر جھولیاں بھر لیں۔ انھوں نے موتیا، چمبیلی، رات کی رانی، سورج مکھی، گلاب، گیندا اور نیاز بو کے پھول توڑ کر مینا بازار کے لیے گجرے اور سر کے تاج بنائے۔ مالی نے دیکھا تو اس کو بہت غصہ آیا مگر اس کی بیوی نے سنبھال لیا۔ مینا بازار میں کامیاب اسٹال لگانے پر مہک کو 'پھولوں کی رانی' کا خطاب ملا اور نقد انعام بھی ملا جس میں سے آدھا اس نے مالی بابا کو دے دیا۔

وفا سعادت نے اس کہانی میں بچوں کو فطرت کے حسین رنگوں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کو باغ کی اہمیت اور باغ کے معطر اور خوشگوار ماحول نیز باغ میں چہچہاتے پرندوں اور پھولوں کی اقسام سے متعارف کروایا ہے۔ کہانی میں پھولوں سے آشنائی اور محبت کا سبق دیا گیا ہے۔ اس میں بچوں کی کردار سازی بھی کی گئی ہے کہ باغ میں جانے سے پہلے اجازت لینا ضروری ہے اور جب اسٹال کا انعام ملا تو مالی کا خاص خیال رکھا گیا۔ اس کہانی میں باغ، پھولوں اور مالی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بچوں کے دل میں پھولوں سے محبت اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے پھولوں کو جیت کا سبب بتایا گیا ہے کہ تاکہ اس مشینی دور میں جہاں پھولوں کی کئی اقسام معدومیت کے دہانے پر ہیں، کوئی تو ہو جو ان میں دلچسپی لے اور ان کو معدوم ہونے سے بچالے۔ یہ کہانی فطرت کے متعلق شعور و آگاہی کی ایک عمدہ کوشش ہے۔

مگر موسمیاتی تبدیلی کے اس دور میں یہ جملے مثلاً سورج مکھی کے پھول کے مسکرانے کے ساتھ ہی مہک کسی کے سر کا تاج بنانے کے لیے مہک پھول کو توڑنے آ پہنچی یا یہ کہ بچیوں نے مختلف قسم کے پھول توڑ توڑ کر اپنی جھولیاں بھر لی یہ بہت تکلیف دہ ہے۔ کیوں کہ پھول اگلے کچھ سالوں کے مہمان ہیں ماحولیاتی اشارے یہ ہی کہہ رہے ہیں کہ اگر عالمی سطح پر توجہ نہ دی گئی تو اس وقت تک پھولوں کی افزائش میں کمی ہو چکی ہو گئی۔ آئندہ آنے والے ادیبوں اور شعرا کو چاہیے کہ وہ بچوں کو موسمیاتی تبدیلوں اور اُن کے مضمرات سے ہر صورت آگاہ کریں۔

سگریٹ نوشی صحت کے لیے بے حد نقصان دہ ہے مگر لوگ سگریٹ کا استعمال کرتے ہیں اور اس انڈسٹری سے لاکھوں لوگوں کا کاروبار وابستہ ہے جیسے ایک دم ختم کرنا ممکن نہیں ہے لہذا عالمی ادارہ صحت ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن WHO کی تجویز کے تحت پاکستان اور دیگر ممبر ممالک اب سگریٹ کے پیک پر یہ جملہ ضرور لکھتے ہیں کہ "سگریٹ نوشی مضرِ صحت ہے" یہ جملہ تمباکو نوشی سے صحت پر پڑنے والے سنگین خطرات سے خبر دار کرنے کے کے لیے ہوتا ہے اس طرح پھولوں کی رانی جیسی فطرت کے رنگوں سے مزّین خوب صورت کہانیوں کے آخر میں بھی سگریٹ نوشی مضرِ

صحت ہے جیسا جملہ ہر صورت میں آنا چاہیے "پھول توڑنا منع ہے" تاکہ انسان اور موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے فطرت کو لاحق خطرات کو کم سے کم کیا جاسکے۔

فطرت کے متعلق آگاہی اور فطرت بطورِ استاد کے حوالے سے اسد بخاری کی کہانی "پنکی اور پنکو" ایک عمدہ تحریر ہے ۔مصنف نے فطرت کے حوالے سے بچوں کی تعلیم و تربیت کی سعی کی ہے۔ خوبصورت جنگل میں رہائش پذیر ایک تتلی اور اس کے دو بچوں پنکی اور پنکو کی کہانی ہے۔ پنکی بہت ضدی ہے۔ دونوں بہن بھائیوں کا اکثر کھانے پینے اور اسکول جانے کے معاملات میں جھگڑا رہتا ہے۔ پنکی ضد کر کر کے اپنی ہر بات منواتی اور ماں کی نصیحتوں کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ چھٹی کے دن دونوں بہن بھائی اچھے کپڑے پہن کر باغ کی سیر کو نکلے۔ ماں نے ہدایت کی کہ باغ میں کچھ پھولوں کے نزدیک نہ جانا کہ وہ نقصان پہنچاسکتے ہیں۔ پنکو نے فوراً بات مان لی اور پنکی کی بھی حفاظت کرنے کی بحامی بھر لی مگر نک چڑی اور ضدی پنکی بولی کہ اس کو کسی کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر بعد پنکو اور پنکی دیگر تتلیوں کے ساتھ باغ میں منڈلانے لگے۔ پنکی کو ایک جگہ کچھ خوبصورت پھول نظر آئے۔ پنکی ان کی طرف بڑھی تو پنکو نے منع کر دیا مگر پنکی نہ مانی اور ضد کرنے لگی کہ صرف قریب سے دیکھے گی۔ پنکو نے مجبور ہو کر اسے جانے دیا اور خود ایک اور پھول کا رس چوسنے لگا اور بہن کی سرگرمیوں سے غافل ہو گیا۔ بھائی کو مصروف دیکھ کر اور موقع پا کر پنکی ایک خطرناک پھول جا بیٹھی اور اس کا رس چوسنے لگی۔ جب اس نے واپس اڑنے کا رداہ کیا تو اسے احساس ہوا کہ اُس کے پاؤں پھول نے جکڑ لیے ہیں۔ وہ مدد کے لیے چیخ و پکار کرنے لگی کہ بھائی بچاؤ۔ پنکو نے دیکھا تو دوڑا چلا آیا مگر پنکی کو پھول کے چنگل سے آزاد کروانا آسان نہ تھا۔ ماں نے ان کو خبردار بھی کیا تھا کہ احتیاط کرنا کیوں کہ جنگل میں کچھ ایسے پھول بھی ہیں جو حشرات کو نگل لیتے ہیں۔ سب کیڑوں مکوڑوں نے کوشش کی اور جب ناکام ہوئے تو پنکو کو کسی کیڑے نے ہدہد کا بتایا کہ اس کی لمبی اور مضبوط چونچ ہوتی ہے وہ پنکی کی مدد کر سکتا ہے۔ پنکو نے ہدہد سے مدد مانگی اور اس نے آ کر پنکی کو بچایا۔ پنکی نے ہدہد کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ اپنی ماں اور بھائی کی بات ماننے کا وعدہ کر لیا۔

اس کہانی میں بچوں کی نفسیات اور ان میں پائے جانے والے مثبت اور منفی رویوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس میں بچوں کو فطرت سے متعلق شعور و آگاہی دینے کے ساتھ ساتھ ان کی کردار سازی بھی کی گئی ہے۔ اس کہانی میں تتلی اور اس کے بچوں رہن سہن بالکل انسانوں جیسا پیش کیا گیا ہے۔ پنکی ضدی ہے۔ دونوں انسانن کے بچوں کی طرح آپس میں لڑتے ہیں۔ پنکی اپنی ضد کی عادت کی وجہ سے ایک دن مصیبت میں پھنس جاتی ہے اور پھر اس کو احساس ہوتا ہے کہ یہ عادت اچھی نہیں۔ بچوں کی عمر سیکھنے کی ہوتی ہے۔ بچے اپنا محاسبہ کرتے ہیں اور والدین اور اساتذہ ایسی ہی کہانیوں کے ذریعے بچوں کی کردار سازی کرتے ہیں۔ اس کہانی میں بچوں کو فطرت سے متعلق شعور و آگاہی بھی

فراہم کی گئی ہے۔ بچے فطرت کے مظاہر سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ وہ تتلیوں کی بود و باش اور ہدہد کے کردار سے سبق حاصل کرتے ہیں اور اس طرح فطرت ایک استاد کے طور پر بچوں کو اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ اس کہانی میں بچوں کو گوشت خور پودے سے متعارف کروایا گیا ہے۔ ان گوشت خور پودوں کو Carnivorous Plant یعنی گوشت خور پودے ان کو خطرناک پودے بھی کہا جاتا ہے۔ ان پودوں کے پھول نما خوبصورت پتے حشرات کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں اور جب حشرات ان پر بیٹھ جاتے ہیں تو یہ ان کو قابو کر کے اپنی خوراک بنا لیتے ہیں۔

رفیع اللہ میاں نے کہانی "باغ میں تتلی" تحریر کی اس میں انھوں نے فطرت کے احترام کا پیغام دیا ہے اور وقت کی پابندی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ نہال وقت پر سو جاتا اس لیے وہ صبح سویرے جاگ اٹھتا۔ موسم بہار کے دن تھے، ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک دن وہ صبح صبح باغیچے میں گیا تو اسے ہلکی ہلکی سفید دھند پھیلی نظر آئی۔ باغیچہ خوش بو سے مہک رہا تھا۔ وہ اپنی کتاب میں بہار، خوش بو اور پھولوں کے متعلق پڑھ چکا تھا۔

> "وہ چنبیلی کے سفید پھول کے پاس رک گیا اور زور سے سانس کھینچی۔ اسے چنبیلی کی خوش بو پسند تھی۔ یکایک اس کو ایک تتلی نظر آئی۔ نارنجی، سفید اور سیاہ رنگ کی تتلی پھول سے اڑی اور اڑتی چلی گئی۔"[۳۴]

نہال نے تتلی کو پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ہاتھ نہ آئی۔ وہ تھک ہار کے بیٹھ گیا۔ اس نے تتلی سے وعدہ کیا کہ وہ اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ تتلی بہت خوش ہوئی اور پھول پر بیٹھ گئی۔ اس نے نہال کو بتایا کہ میرا نام 'مونارک' ہے۔ تتلی نے مزید بتایا کہ مونارک بڑی اور زہریلی تتلی ہوتی ہے۔ وہ ہر سال ایک جگہ سے دوسری جگہ میلوں کا سفر طے کر کے ہجرت کرتی ہے۔ مونارک تتلی کے والدین اس کے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور یہ دیکھ کر نہال بھی پریشان ہو گیا ہے نہال اور تتلی کی دوستی ہو گئی۔ نہال چاہتا تھا کہ تتلی اب اس کے پاس رہے مگر تتلی نے بتایا کہ مجھے مت روکو۔ مجھے بہت دور جانا ہے۔ تتلیاں بس ایک بار سفر کرتی ہیں، پھر مر جاتی ہیں۔ نہال اداس ہو گیا۔ تتلی نے مزید بتایا کہ مونارک تتلی کے بچے یتیم پیدا ہونے کے بعد بھی گھبراتے نہیں ہیں اور اپنے رنگین پروں سے دنیا میں رنگ بھرتے ہیں۔ یہ کہہ کر تتلی اڑی اور اڑتی چلی گئی۔

مصنف نے نہال اور تتلی کے مکالمے کو بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں تتلی کی خوب صورتی اور اس کے حال احوال سے بچوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔ اس میں رات کو جلدی سونا اور صبح جلدی اٹھ کر فطرت سے لطف انداز ہونے کی ترغیب دی گئی۔ جو بچے صبح جلدی بیدار ہوتے ہیں وہ ہی پھولوں، تتلیوں، باغوں، پرندوں کے گیتوں اور پھولوں کی خوش بو سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کہانی سے فطرت کو نقصان نہ پہنچانے اور اس کی

حفاظت کرنے کا درس بھی ملتا ہے۔ نہال تتلی کو پکڑتا نہیں ہے بس اسے پھولوں پر بیٹھا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ ہی اس کہانی کی سب سے اچھی بات ہے۔

جیسا کہ انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سماجی حیوان ہے اور اپنی ضروریات کے لیے دوسرے انسانوں کا محتاج ہے اسی طرح دنیا کی دیگر مخلوق یعنی پرندے، جانور، ،کھیت ،،بارشیں ،حشرات ،درخت وغیرہ سب کی ضرورتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ فطرت کے تمام عناصر ایک دوسرے سے متصل ہوتے ہیں۔ یہ ہی اس خوبصورت لوک کہانی "بڑھیا اور بلی "کا بچوں کے لیے پیغام ہے جو فضل بلوچ تحریر کی۔ ایک بڑھیا ایک کٹیا میں رہتی تھی۔ بڑھیا نے دودھ کے لی ایک بکری پال رکھی تھی۔ ایک دن ایک بلی کٹیا میں رکھے برتن سے دودھ پی جاتی ہے۔ اگلے دن بڑھیا کلہاڑی کے وار سے بلی کی دُم کاٹ دیتی ہے۔ بلی روتے ہوئے التجا کرتی ہے کہ میری دُم واپس کر دو میں نے شادی پر جانا ہے مگر بڑھیا دودھ کی واپسی کا مطالبہ کرتی ہے۔ بلی بکری سے دودھ کی درخواست کرتی ہے تو بکری اس سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس کو درخت کی کچھ شاخیں لا کر دی جائیں۔ جب بلی نے درخت کو اپنی روداد سنائی اور چند شاخوں کی درخواست کی تو درخت نے اس کے بدلے میں ایک گھونسلے کا مطالبہ کر دیا۔ دم کٹی بلی فاختہ کے پاس جاتی ہے اور ایک گھونسلا بنانے کی استدعا کرتی ہے۔ فاختہ بلی پر اناج لانے کی شرط عائد کر دیتی ہے۔ بلی ہانپتے کانپتے کسان کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ کسان بلی سے کہتا ہے کہ کھیت کے لیے کچھ فصلیں لے کر آؤ۔ بلی کھیتی سے درخواست کرتی ہے کہ کچھ فصلیں دے دے۔

> "پیاری کھیتی مجھے کچھ فصلیں دے دو تا کہ میں کسان کو دے کر اناج حاصل کر سکوں اور وہ اناج فاختہ کھائے گی اور درخت کے لیے گھونسلہ بنا کر دے گی میں اس کے بدلے درخت سے وہ شاخیں لے کر بکری کو دوں گی بکری شاخیں کھا کر دودھ دے گی اور میں بڑھیا کو دودھ واپس لوٹا کر اپنی دُم واپس لے لوں گی"۔[۳۵]

کھیتی نے بلی سے پانی کا تقاضا کیا اور کہا کہ مجھے پانی سے سیر اب کرو۔ بلی کو مایوسی ہوئی اور آخر کار وہ خدا سے مدد کے لیے دعا مانگنے لگی۔ خدا نے بلی کی دعا سن لی اور خوب مینا برسا۔ کھیت سیر اب ہو گیا۔ کسان نے بلی کو اناج دیا۔ وہ اناج لے کر سیدھا فاختہ کے پاس آئی۔ فاختہ نے درخت کے لیے گھونسلا دیا، درخت نے شاخیں دے دیں اور بکری نے شاخیں کھا کر بلی کو دودھ دے دیا۔ بلی نے دودھ بڑھیا کے حوالے کر دیا اور اپنی دُم واپس لے لی۔

اس بلوچی لوک کہانی میں بچوں کو نظام قدرت کے مختلف عناصر کا آپس میں تعلق سمجھایا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ فطرت کے سبھی عناصر اپنی ضروریات کے لیے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ فطرت سے کٹ کر زندگی ناممکن

ہے۔ اس دنیا میں سب مخلوقات کو ایک خاص طریقے سے آپس میں جوڑ کر رکھا گیا ہے۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح انسان کو بکری کا دودھ، بکری کو درخت کی شاخیں، درخت کو پرندے، پرندوں کو اناج چاہیے ہوتا ہے اور اناج کی فصل کھیتوں میں ہوتی ہے جیسے کسان تیار کرتا ہے اور کھیت کے بارش درکار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کہانی میں اخلاقی سبق کے ذریعے بچوں کی کردار سازی بھی کی گئی ہے جیسے بغیر اجازت کے کسی کی چیز لینا باعثِ سزا بن سکتا ہے۔ بلی نے بڑھیا کی بغیر اجازت دودھ پی لیا جس کے جواب میں بڑھیا نے بلی کی دُم ہی کاٹ ڈالی جو انسان کی طرف سے سزا میں تجاوز ہے یہ بے زبان کے ساتھ بے رحمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سبق بھی شامل ہے کہ انسان کو جد وجہد نہیں چھوڑنی چاہیے اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس بلی کی طرح انسان کی زندگی بھی مایوسی اور امید کی کشمکش میں گزرتی ہے مگر کسی موڑ پر اگر دنیا والے ٹھکرا بھی دیں تو مایوس ہونے کی بجائے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں رہنا چاہیے اور اپنے رب سے دعا مانگتے رہنا چاہیے۔

رخشندہ بیگ کی کہانی "آدم اور گولو مولو" میں انھوں نے بچوں کو فطرت سے محبت اور اُن کے تحفظ کا درس دیا ہے۔ نو سالہ آدم اپنے والدین اور اپنی چھوٹی بہن مونا کے ساتھ جنگل کے اس پار دو پہاڑوں کے درمیان ایک سر سبز وادی میں رہتا تھا جو سبز مخملی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ رسیلی خوبانیوں سے ڈھکے درخت اور خوش ذائقہ سرخ سیب اس وادی کی پہچان تھے۔ آدم ان نظاروں سے خوب لطف اندوز ہوتا۔ وادی میں برف پگھل چکی تھی۔ ایک دن وہ اپنے دوست ڈم ڈم کے ہمراہ گھر سے نکلا اور سیر کرتے کرتے دونوں کافی دور نکل گئے۔ ایک جگہ ان کو جھاڑیوں میں دو برف کے گولے حرکت کرتے نظر آئے۔ دونوں حیران ہو گئے اور تجسس میں آگے بڑھے تو انھیں پتا چلا کہ وہ دو خرگوش کے بچے ہیں۔ وہ روئی کے گالوں کی طرح سفید اور ریشم کی طرح نرم و ملائم تھے۔ وہ بہت بھوکے تھے۔ آدم نے ان کو اٹھایا اور اپنے گھر لے آیا۔ اس نے دونوں کے نام 'گولو' اور 'مولو' رکھ دیے۔ آدم اور اس کی بہن مونا نے ان دونوں ایک لکڑی کے ڈبے میں رکھا اور سبزیاں کھانے کو دیں۔ آدم کے والدین جانوروں اور پرندوں کو گھر میں قید رکھنے کے خلاف تھے اس لیے اس نے خرگوشوں کے متعلق گھر میں نہیں بتایا۔ اس کی امی اور دادی حیران تھیں کہ روز روز سبزیاں غائب کیوں ہو رہی ہیں؟ گولو اور مولو بڑے ہوتے گئے اور ایک ہی ڈبے میں رہ رہ کر سست بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن آدم کے والد نے خرگوش دیکھ لیے۔ آدم ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ باپ نے افسوس اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں آدم سے کہا:

> "میں نے تمھیں اچھی طرح سمجھایا تھا کہ پرندوں اور جانوروں کے بچوں کو ان کے ماں باپ سے الگ نہیں کرتے۔ یہ ان کے ساتھ ظلم ہے۔ اگر تمھیں کوئی ہم سے الگ کرے تو تمھیں

کیسا لگے گا؟" آدم نے آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اب گولو اور مولو کو جنگل میں چھوڑنا ان کے لیے خطرے کا باعث تھا کیوں کہ وہ شکاری جانوروں سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا آدم کے والد نے گھر کے وسیع احاطے میں ان کی رہائش کا بندوبست کیا جہاں وہ آزاد ماحول رہ سکتے تھے"۔[۳۶]

رخشندہ بیگ نے اس کہانی میں ایک سرسبز و حسین وادی کی منظر کشی اتنے خوبصورت پیرائے میں کی ہے کہ انسان دو پہاڑوں کے درمیان اس دلکش وادی میں خود کو سیر کرتا محسوس کرتا ہے۔ یہ کہانی بچوں کو فطرت سے محبت کی ترغیب دلاتی ہے۔ آدم خرگوش کے بچوں سے محبت کرتا ہے مگر اس کو یہ ادراک نہیں کہ انھیں ان کے ماں باپ سے جدا کر کے قید میں رکھنا ان کے لیے اذیت کا باعث ہے۔ کہانی میں بچوں کو اس امر سے آگاہ کیا گیا ہے کہ جانوروں کو ان کے قدرتی ماحول سے جدا کرنا اور ان کی آزادی کو سلب کرنا اچھا کام نہیں ہے۔ اس کہانی میں آدم کے والد کا کردار اہم ہے۔ انھوں نے بچے کو ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے ذریعے نہیں بلکہ پیار سے سمجھایا کہ آدم نے غلطی کی ہے اور اس غلطی کا ازالہ بھی عقل مندی سے کیا۔ اس طرح بچوں کو یہ سبق ملا کہ فطرت سے صرف محبت ہی نہیں بلکہ اس کی حفاظت کے لیے بھی سرگرم رہنا چاہیے۔ اس کہانی میں بچوں کے لیے ایک پیغام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے والدین کو اپنی ہر سرگرمی سے آگاہ کریں اور کوئی کام اپنے والدین کے علم میں لائے بغیر نہ کریں۔

سہ ماہی ادبیات اطفال میں ایسی کہانیاں اور نظمیں شامل کی گئی ہیں جن میں مختلف جانوروں اور پرندوں سے بچوں کو متعارف کروایا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں سے ایک جمیل جالبی کی کہانی "نادانی کی سزا" ہے جو بچوں کے لیے دلچسپ اور اخلاقی تربیت سے بھرپور ہے۔ کہانی ایک گرمی کے مارے شیر کی ہے جو کسی گھنے درخت کے سائے تلے ستا رہا تھا۔ شیر کو سوتا دیکھ کر ایک چوہا شیر کی پیٹھ پر چڑھ کر کھیلنے لگا۔ شیر جاگ گیا اور چوہے کو دبوچ لیا۔ چوہا بہت ڈر گیا اور شیر سے التجا کرنے لگا کہ:

"اے جنگل کے باشاہ! رحم کیجیے۔ مجھ جیسے کمزور کو مارنے سے آپ کے خاندانی وقار پر آنچ آئے گی اور تمام جنگل میں آپ کی بدنامی ہو گی کہ جنگل کے بادشاہ نے ایک چوہے کو مار دیا ہے۔"[۳۷]

یہ سن کر شیر نے ہانپتے کانپتے چوہے کو آزاد کر دیا۔ چند دن بعد یہی شیر کچھ شکاریوں کے جال میں پھنس گیا۔ چوہے نے جب دیکھا تو فوراً وہاں پہنچا اور اپنے تیز دانتوں سے جال کو کتر کر شیر کو آزاد کروا دیا۔ شیر چوہے سے بہت خوش ہوا اور اس سے وعدہ کیا کہ جو وہ مانگے گا، اسے مل جائے گا۔ چوہے نے شہزادی شیرنی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

شیر نے زبان دی تھی لہٰذا مان گیا۔ شادی کے دن شیرنی دلھن بن ٹھن کر نکلی اور جھومتی ہوئی چلی آئی۔ دولھا چوہا استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ اچانک بے خیالی میں دلھن کا پاؤں دولھے پر آ گیا وہ بے چارہ وہیں جان سے گیا۔

اس کہانی میں مزاح کا عنصر بھی ہے مگر یہ ایک سبق آموز کہانی ہے کہ انسان کو اپنی حیثیت کے مطابق خواہش کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ ہر چیز کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ نیکی اور احسان کا بدلہ نیکی اور احسان ہے شیر چاہے جتنا طاقت ور ہو، جال کترنے کا ہنر صرف چوہے کے پاس ہے لہٰذا کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

حوالہ جات:

۱۔ڈاکٹر محمد شیعب خان۔"زمین کا مقدمہ"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۷(اپریل تا جون۲۰۲۱ء)،ص۳۱۔

۲۔ایضاً،ص۳۲۔

۳۔ایضاً،ص۳۷۔

۴۔ایضا،ص۳۸۔

۵۔ایضا،ص۳۹۔

۶۔ایضا،ص۳۹۔

۷۔ڈاکٹر محمد شیعب خان۔"طوطے کا پیغام"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۲(جولائی تا ستمبر۲۰۲۲ء)،ص ۵۶۔

۸۔ایضاً،ص۶۰۔

۹۔ایضاً،ص۶۳۔

۱۰۔فرزانہ روحی اسلم"چار اطخ چار بطخ"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتَ اطفال،ش۳(اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۷ء)،ص۴۹۔

۱۱۔ایضاً،ص۵۲۔

۱۲۔کے ایم خالد"تم نہ سمجھو گئے"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۲(جولائی تا ستمبر۲۰۲۰ء)،ص۷۸۔

۱۳۔ایضاً،ص۸۱۔

۱۴۔ایضاً،ص۸۱۔

۱۵۔ایضاً،ص۸۴۔

۱۶۔فریدہ حفیظ"ندی کا سفر"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۶(جولائی تا ستمبر۲۰۱۸ء)،ص۳۷۔

۱۷۔طوبیٰ صدیقی "کھٹ بڑھئی" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۲(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۲ء)،ص۱۰۰۔

۱۸۔ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی،اُردو ادب: ماحولیاتی تناظر میں (لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۲۱ء)

۱۹۔تسنیم شریف،"بستی میں ہمیں بھی رہنے دو "مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۲۰(جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء)،ص۵۹۔

۲۰۔ایضاً،ص۶۱۔

۲۱۔ایضاً،ص۶۱۔

۲۲۔تسنیم جعفری،"زمین پر اجنبی" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۰(جنوری تامارچ ۲۰۲۰)،ص۵۷۔

۲۳۔سعد لخت،"چور کون" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۰(جنوری تاجون ۲۰۱۸ء)،ص۱۲۔

۲۴۔مجید ظفر انوار حمیدی ،"اور چڑیاں اڑ گئی "مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۲ (اکتوبر تا مارچ ۲۰۲۰ء)،ص۳۸

۲۵۔سید عثمان عبداللہ،"احساس" مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال،ش۷(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء)،ص۱۲۱

۲۶۔ایضاً،ص۱۱۲۔

۲۷۔فرخندہ لودھی،"پیار کا پنچھی" مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال ،ش۵(اپریل تاجون ۲۰۱۸ء)،ص۲۴۔

۲۸۔حسن ذکی کاظمی،"مضبوط رشتہ" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۷(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء)،ص۴۔

۲۹۔معظمہ تنویر،"بہزاد بھائی کا طوطا" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۷(اپریل تاجون ۲۰۲۱ء)،ص۱۱۰۔

۳۰۔نعمان فاروق،نادان کوّا مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۳(اپریل تاجون ۲۰۲۰)،ص۵۷۔

۳۱۔خلیل جبار،ناشکرا کوّا مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۷(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء)،ص۹۸

۳۲۔منزہ غفور،"سگی ماں کا گیت" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۵(اپریل تاجون ۲۰۱۸ء)،ص۱۲۸۔

۳۳۔فرزانہ روحی اسلم،پھول بچ گیا مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۹(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء)،ص۱۸۲۔

۳۴۔رفیع اللہ،"باغ میں تتلی" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۹(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء)،ص۱۱۱۔

۳۵۔ فضل بلوچ، "بڑھیا اور بلی" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۲۲(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۲ء)،ص۱۵۰۔

۳۶۔ رشندہ بی بی، "آدم اور گولو مولو" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۲(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۲ء)،ص۶۴۔

۳۷۔ جمیل جالبی، "نادانی کی سزا" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۱۸(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء)،ص۸۵۔

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال کی نظموں اور کہانیوں میں فطرت کو لاحق خطرات، ان کا تحفظ اور ہماری ذمے داریاں

فطرت کو لاحق خطرات اور ہماری ذمہ داریاں:

ماہرِ لسانیات نوم چومسکی موسمیاتی تبدیلیوں کے خطرات سے اقوامِ متحدہ کو آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"دو نسلوں کے بعد ایک منظم انسانی معاشرے کا وجود ناپید ہو سکتا ہے، عالمی موسمیاتی حدت جس نے انسانی بقا کو خطرے میں ڈال دیا ہے جس کے سبب انسانی زندگی کو خطرہ ہے جو کہ ایٹمی جنگ کے خطرے سے کم نہیں ہے۔"[1]

یہ دور اینتھروپوسین(Anthropocene Epoch) یعنی انسانی سرگرمیوں میں اضافے کی بدولت ماحولیاتی آلودگی کا دور ہے جس میں بنی نوع انسان داخل ہو چکا ہے۔ انسانی سرگرمیوں کی وجہ سے موسمیاتی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ درجہ حرارت میں غیر معمولی اضافے سے وسیع پیمانے پر آگ لگنے، گلیشئرز کے تیزی سے پگلنے، شدید سلاب، سطح سمندر میں اضافہ اور پانی کے ذخائر میں کمی جیسے عوامل نہ صرف انسانوں کی تباہی کے لیے کافی ہیں بلکہ بڑے پیمانے پر ندے، جانور اور دیگر انواع بھی معدوم ہو رہی ہیں۔ جارج مونبیاٹ (George Monbiot) موسمیاتی تبدیلی اور بڑھتے ہوئے عالمی درجہ حرارت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"The campaign against climate change is a campaign against disaster. It is not a campaign for more freedom but for less. we must now understand that the future we must choose is one in which we consume less, travel less and use less energy."[2]

مونبیاٹ کے مطابق ماحولیاتی بحران کے خلاف مہم ہمیں وسائل مہیا کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ ہمیں آنے والے اُن خطرات سے بچانے کے لیے ہیں جو آئندہ آنے والی نسلوں کی حفاظت اور بقا کے لیے ضروری ہیں۔ موسمیاتی

تبدیلیوں کے مضر اثرات اور تباہ کاریوں پر قابو پانے کے لیے ہمیں مؤثر اور پائیدار حکمت عملی کی ضرورت ہو گی اس بحران سے بچنے کے لیے فوسل فیولز کے استعمال کو کم کر کے شمسی توانائی اور پن بجلی کے استعمال کو فروغ دینا ہو گا، انسانی سرگرمیوں کو محدود کرنا ہو گا، گرین ہاوس گیسیز کو کم کرنے، جنگلات لگانے اور ماحولیاتی تحفظ کو فروغ دینے کے لیے بھاری سرمایہ کاری کرنے کے ساتھ ساتھ انتظامی اقدامات کی ضرروت ہو گی۔ ہمیں اپنا طرزِ زندگی بدلنا ہو گا کیوں کہ ماحولیاتی تبدیلیوں کے خطرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ غفلت انسان اور فطرت کو مزید تباہی کی طرف لے جائے گی۔ جارج مونبیاٹ مزید اس حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "We cannot solve the problem by pretending it does not exist. We cannot keep living as we do today and expect to avoid disaster."[۳]

یہ خیالات اُن کے جذبات، فطرت سے محبت، ماحولیاتی پاکیزگی اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ نہ صرف اُن کا ذاتی احساس ہے بلکہ ایک عالمی پیغام بھی ہے جو دنیا کو عالمی بحران سے باہر نکالنے کے لیے فکر مند ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون "The child inside" میں لکھا:

> "دورِ حاضر میں بچے کنکریٹ کے جنگل میں پرورش پا رہے ہیں۔ وہ گھروں اور اسکولوں اور گاڑیوں کے اندر تک محدود ہیں وہ فطرت کے دلکش رنگوں سے محروم ہیں۔ جس قدرتی ماحول میں ہم پروان چڑھے فطرت کے وہ حسین رنگ ہماری آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہے ہیں،"[۴]

دنیا بھر میں بچے فطرت کے متعلق شعور کے سبب اور ماحولیاتی تحفظ کی تحریکیوں میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ۲۰۱۹ء میں بچوں کے ماحولیاتی مظاہروں " Youth strike for climate " کی حمایت کی ہے مونبیاٹ کہتے ہیں کہ:

> "ہماری نسل نے زمین کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ میں ان بہادر بچوں کو سلام پیش کرتا ہوں جو ماحولیاتی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔"[۵]

موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آنے والی نسل کا مستقبل ایک ڈروٗنا خواب بن چکا ہے۔ جہاں آبی آلودگی، فضائی آلودگی، زمینی آلودگی، غذائی قلت، قدرتی آفات، شدید موسمی حالات اُن کی زندگی کا حصہ بن جائیں گئے اور انواع معدوم ہو جائیں گی۔ یہ بات درست ہے کہ موسمیاتی تبدیلی ایک مسئلہ ہے جیسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ خود تھم جانے والا طوفان نہیں ہے آج کا انسان جس طریقے اور لاپروائی سے زندگی گزار رہا ہے اسے آنے والی تباہی سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ مستقبل میں ایسی سرزمین میں رہنے کے خواہاں ہیں جہاں آنے والی نسلیں محفوظ رہیں جو اُن کی ملکیت ہو جہاں وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے زمینی اخلاقیات کا خیال رکھیں تو پھر ہی بنجر زمین سرسبز ہو سکتی

ہے جو جنگلات کی کٹائی اور شدید ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے مرجھا گئی ہے شاہد پھر سے مسکرانے لگے۔ سمندری حیات جو انسانی مداخلت کے سبب ختم ہو گئی ہیں شاہد واپس آجائیں۔ یعنی سمندر اور زمین دونوں میں فطری توازن بحال ہو جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مستقبل میں آنے والی نسلیں خوب صورت، محفوظ اور قدرتی دنیا کو دیکھیں۔ ایک ایسی جگہ جہاں پھول کھلتے ہوں، جگنو تاروں کی طرح ٹمٹماتے ہوں، پھولوں کے گرد منڈلاتی ہوئی رومان پرور تتلیاں ہوں، لہلاتے کھیت ہوں، ہرے بھرے مسافر نواز درخت ہوں اور موسم خوشگوار ہو۔ اگر ماحول پھر سے بحال ہو جائے تو معاشی بحالی ہو گی ماہی گیر، زمیندار اور دیگر افراد جو قدرتی وسائل پر انحصار کرتے ہیں پھر سے مسکرانے لگیں گئے۔ ماحول کی پاکیزگی معیشت کو بھی فائدہ پہنچائے گئی۔ ماہرینِ ماحولیات ایک عرصہ سے ماحولیاتی بحران کے خطرے سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہیں مگر انسان ماحولیاتی انصاف کو قائم نہ رکھ سکا وہ زمینی اخلاقیات کو فراموش کر چکا ہے۔ زیرِ زمین ایندھن نکالنے کے منصوبے ہوں یا جنگلات کی کٹائی یا شہری آبادیوں کا غیر منظم پھیلاؤ انسان اپنی دھن میں مگن ہے۔ ذرائع نقل و حمل اور صنعتوں سے خارج ہونے والی زہریلی گیسوں کے اخراج کے ماحولیاتی اثرات سے آج کا انسان ایسے غافل ہے جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہیں۔

نوم چومسکی نے دنیا کی حکومتوں کا ضمیر جھنجھوڑنے کے لیے گلوبل تھرموسٹیٹ نامی ایک کمپنی کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کمپنی کا خاص مقصد ہوا سے پیدا ہونے والی بجلی اور شمسی توانائی کو فروغ دینا ہے تاکہ قدرتی ایندھن کے استعمال کی وجہ سے ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کو ختم کیا جا سکے۔

ماحولیاتی بحران صرف چند ممالک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اقوامِ عالم کا مسئلہ ہے کیوں کہ اس کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی ایک ملک تنہا اس پر قابو پا سکتا ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق اگر اس پیچیدہ مسئلے پر قابو نہ پائے گا تو آئندہ آنے والی نسلوں کا مستقبل تاریک ہوتا چلا جائے گا۔ موسمیاتی تبدیلی اور عالمی حدت زمین کے لیے عظیم ترین خطرے کی علامت بن چکے ہیں۔

دنیا میں مختلف بحران آتے رہتے ہیں لاکھوں انسانوں نے ہجرت بھی کی یعنی پناہ گزینوں کا بحران، ایٹم بم کا استعمال ہوا، کیمیائی ہتھیار آزمائے گئے، قحط بھی آئے اور سیلاب کی تباہ کاریوں کا بھی انسان نے سامنا کیا اور ایک عرصہ تک ان کے اثرات باقی رہے پھر بھی یہ بحران عارضی تھے مگر موسمیاتی تبدیلی کا بحران جس نے پوری انسانی تہذیب کا مستقبل خطرے میں ڈال دیا ہے یہ ایک انتہائی سنجیدہ نوعیت کا مسئلہ ہے بعد میں اس بحران کا ازالہ ناممکن ہو گا۔ یہ ایک ایسی رات ہو گی جس کی کوئی صبح نہیں۔

اگر ہنگامی بنیادوں پر موسمیاتی تبدیلیوں سے نبر آزما ہونے کی کوشش نہ کی گئی تو آئندہ اس بحران کی تلافی ناممکنات میں سے ہو گئی۔ ماہرِ موسمیات باورچ رنکیوچ (Baruch Runkiewicz) نے آنے والی نسلوں کے مستقبل کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے کہا کہ:

> "ہمارے بعد طوفان عظیم ہو گا۔ لوگوں کو ادراک نہیں کہ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے وہ مناظر جو ہم دیکھتے ہیں، وہ پانی جو ہم پیتے ہیں، وہ خوراک جو ہم کھاتے ہیں، ہوا جس میں سانس لیتے ہیں، روزمرہ کا معمول، موسم، سمندر، دریا، جنگل، گرمی، سردی، بہار، خزاں اور بلند معیارِ زندگی سب کچھ بدل جائے گا آنے والی نسلیں یا تو اس ماحول میں ڈھل جائیں گی یا معدوم ہو کر رہ جائیں گی۔ مگر مجھے کیا ہے، میں مطمن ہوں کیوں کہ اُس وقت موجود نہیں ہوں گا"[۶]

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال فطرت کا تحفظ اور ہماری ذمہ داری کے تناظر میں:

۲۰۱۷ء تا ۲۰۲۳ء تک شائع ہونے والے ان بچوں کے رسالوں میں مختلف موضوعات پر ادیبوں نے قریب چھے سو کہانیاں تحریر کی ہیں۔ اسی طرح مختلف شعرا نے ۱۹۶ نظمیں لکھیں جن میں سے ایک سو کے قریب کہانیاں اور ۸۵ نظمیں بچوں میں فطرت کے متعلق شعور اجاگر کرنے اور بچوں کو تعلیمی سرگرمیوں کی طرف راغب کرنے کے لیے ان رسالہ جات کی زینت بنی۔ ان کہانیوں اور نظموں میں پھولوں، تتلیوں، چہچہاتے پرندوں، جنگلی اور آبی حیات سے بچوں کو روشناس کروایا گیا۔ نیز خوبصورت نظاروں، جنگلات، مختلف موسموں، برسات، گلیشرز، چاند، ستاروں اور کائنات کے دیگر موضوعات کا نثر نگاروں اور شعرا نے انتخاب کیا۔

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال، اسلام آباد (۲۰۲۲ء۔۲۰۱۸ء)	
کُل جریدے	۶۴
کُل کہانیاں	۶۰۰
کُل نظمیں	۱۹۴
فطرت اور ماحول کے حوالے سے لکھی گئی نظمیں	۸۵

ادبِ اطفال میں لکھاریوں نے بچوں کے تعلیمی مدراج اور اُن کی عمر کے مطابق شعور کی پختگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان نظموں اور تحریروں میں فطرت کو لاحق خطرات اور ان خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے انسان کی کیا ذمہ داریاں ہیں کے متعلق بھی آگاہ کیا ہے۔ ان بچوں کے رسالوں میں ۲۰۱۷ء سے ہی کہانیوں کے مصنفین اور شعرا نے بچوں کو

تتلیوں اور جگنو کو پکڑنے، پرندوں اور جانوروں کو قیدی بنانے، آبی اور فضائی آلودگی پھیلانے، جیسی فطرت اور ماحول دشمن سرگرمیوں سے منع کیا ہے جس سے نہ صرف بچوں میں فطرت سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ اُن میں ماحول دوست سرگرمیوں کو بھی فروغ ملتا ہے۔ ان رسالہ جات میں گاڑیوں، کارخانوں سے نکلنے والے دھویں کے سبب ماحولیاتی آلودگی اور اس کے نتیجے میں خود انسان اور فطرت کو ہونے والے بد اثرات سے بھی خبر دار کیا گیا ہے۔ شاہد اس لیے کہ بچے کہانیاں پڑھ کر اپنے بڑوں کو کہہ سکیں کہ کہ خدارہ بچوں کا مستقبل تاریک ہونے سے بچائیں۔ ان بچوں کے رسالوں میں ۲۰۱۷ء سے ہی کہانیوں کے مصنفین اور شعرا نے بچوں کے لیے، عصرِ حاضر کا سب سے بڑے مسئلے موسمیاتی تبدیلی اور ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام چھوڑا ہے۔ جیسے تتلی پہ لکھی گئی ایک خوب صورت نظم کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

بچے اس کو جانے ہیں اس کے وہ دیوانے ہیں
وہ معصوم سے دیکھو تو پکڑو تو پھر چھوڑ بھی دو[۷]

تتلی خدا کی بے حد نازک اور خوب صورت تخلیق ہے۔ ادریس بابر نے ادبیات اطفال میں تتلی کے تحفظ کے لیے بچوں کو مشورہ دیا کہ اگر اسے پکڑو تو چھوڑ دو مگر تتلی کو پکڑ لیا جائے تو وہ اپنے نازک پروں سے محروم ہو جاتی ہے نیز شاعر نے اپنی نظموں میں یہ نہیں لکھا کہ تتلی کو معدوم ہونے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ تتلی کے مسکن و تحفظ کو کیسے ممکن بنایا جا سکے ہیں۔

اس طرح جگنو کے متعلق جان کاشمیری نے "روشنی کے بغیر" کے نام سے نظم لکھی:

اس کا بدن ہے روشن ایسے
نور کا کوئی ذرا ہو جیسے[۸]

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی شاعر جگنو اور تتلی کو موضوع سخن بناتے رہے ہیں مگر اُس دور میں موسمیاتی تبدیلی کے قہر سے برصغیر کا خطہ محفوظ تھا۔ تتلی اور جگنو جیسے فطرت کے خوب صورت مظاہر معدومیت کے خطرے سے دوچار نہ تھے لیکن ادبیاتِ اطفال کی نظموں میں ان کے تحفظ اور اس سلسلے میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں، ذکر نہیں کیا گیا کہ تتلی اور جگنو کو باغات پھول، شفاف پانی اور آب و ہوا درکار ہوتے ہیں اس طرح مصنوعی روشنیوں میں جگنو اپنے ساتھی سے بچھڑ جاتے ہیں۔ یہ اندھیری یا چاندنی راتوں کے مسافر ہوتے ہیں۔ تتلی اور جگنو دونوں کو سانس لینے کے لیے لطیف فضا چاہیے جو آلودگی سے پاک ہو۔ پھول اور باغات تتلی اور جگنوؤں کے مسکن ہیں جو سمیاتی تبدیلیوں کے باعث تباہ ہو رہے ہیں۔ جگنوؤں کو چشمے اور ندیا کا شفاف پانی درکار ہے۔ مصنوعی روشیناں جگنوؤں کو

اپنے راستے سے بھٹکا دیتی ہیں اور وہ اپنے ساتھی سے بچھڑ جاتے ہیں۔ کیڑے مار ادویات کے چھڑکاؤ نے جگنوؤں، تتلیوں اور شہد کی مکھیوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ دنیا کے کئی ممالک ان کو معدومیت سے بچانے کے لیے اقدمات کر رہے ہیں۔ جن میں جاپان سرِ فہرست ہے۔ جاپان نے جگنوؤں کی افزائش اور اُن کو قدرتی ماحول مہیا کرنے کے لیے پارکس بنائے ہیں۔ جگنو کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے ہر سال یہاں پر "جگنو میلا" منعقد کیا جاتا ہے۔ جس کو (Hotaru Matsuri) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جاپان کے علاوہ امریکا، تھائی لینڈ، ملائیشیا، برطانیہ، جرمنی اور بھارت بھی جگنو، تتلیوں اور شہد کی مکھیوں کے مسکن کو بچانے کے لیے آگاہی کی مہمات چلا رہے ہیں۔ کیمیل اسپرے پر قوانین بنائے جا رہے ہیں۔ جنگلات میں اضافہ کر کے اور ماحولیاتی آلودگی پر قابو پا کر فطرت کے ان خوب صورت مظاہر کو معدوم ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ کہانیوں، نظموں اور مختلف سرگرمیوں کے زریعے بچوں کو فطرت کے تحفظ کا درس دیا جا سکتا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے پرندے بے گھر ہو چکے ہیں۔ فصلوں، کھیتوں اور جنگلات کی کٹائی کے باعث انھیں غذائی قلت کا سامنا ہے۔ ہماری روایتی چڑیا، طوطے اور ہدہد ناپید ہوتے جا رہے ہیں نیز موسمیاتی تبدیلی پرندوں پر بری طرح اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ادبیات اطفال شمارہ ۱۰ میں تسنیم شریف نے کہانی "مانی اور طوطا" میں بچوں کو پرندوں سے محبت کا درس دیا اور پرندوں کو قیدی بنانے کی مذمت کی۔

> ""اگر تمہیں کوئی ایک کمرے میں بند کر دے۔ مزے مزے کی چیزیں دیں مگر کبھی بھی تمہیں باہر نہ نکلنے دے تو تمہیں کیسا لگے گا؟" پاپا نے پوچھا تو مانی سے کوئی جواب نہ بن پایا۔ " دیکھو سارے پرندے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اپنی امی پاپا کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔ پرندے تو آسمان پہ اڑتے ہوئے درختوں پر چہچہاتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ مگر ہم انسان انہیں پکڑ کر قید کر دیتے ہیں۔ کتنی بری بات ہے نا؟" پاپا نے نومی کی دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے پیار سے سمجھایا"[۹]

اسی طرح ایک رسالے میں ڈاکٹر شعیب خان کی ایک تحریر "زمین کا مقدمہ" میں زمین، پرندے، ہوا، پانی اور درخت سب ہی فطرت اور ماحول کا سب سے بڑا دشمن اور تباہی کا ذمہ دار انسان کو ٹھہراتے ہیں اور انسان کے خلاف مدعی ہیں۔ زمین کو شکایت ہے کہ میری کوکھ سے جنم لینے والے چھوٹے بڑے درختوں کو انسان نے کاٹ ڈالا ہے۔ پانی ہوا کہتے ہیں انسان نے ہمیں زہر آلود بنا دیا ہے۔ پرندے اور جنگلی حیات سراپا احتجاج ہیں کہ انسان نے درخت اور جنگلات کو نقصان پہنچا کر ہمارے مسکن ہم سے چھین لیے ہیں۔ اس ماحولیاتی تحریر میں مصنف نے بچوں کو شجر کاری

اور درختوں کے فوائد سے آگاہ کیا ہے۔ موسموں کو اعتدال میں لانے کے لیے جنگلات میں اضافہ کیا جائے۔ گاڑیوں اور کارخانوں سے خارج ہونے والے دھوئیں پر قابو پایا جائے اور ماحول کو پاکیزہ رکھا جائے۔ کوڑا کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کے لیے مناسب انتظام کیا جائے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> "انسان نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس ماحول کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ زمین کے چھوٹے بیٹے جو درخت کہلاتے ہیں ان کا بے دردی سے قتل عام کیا جارہا ہے۔ زمین کے بڑے بیٹے یعنی پانی کو بھی زہر دے کر قتل کرنے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے۔ جب کہ زمین کی بیٹی ہوا کو مختلف گیسوں سے زہر آلود کیا جارہا ہے"۔[۱۰]

دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی ماحولیاتی تبدیلی کے اثرات نمایاں ہیں۔ گرمیوں کی شدید لہروں اور تباہ کن سیلابوں نے کڑوروں لوگوں کی زندگیاں اور کاروبار متاثر ہو رہے ہیں۔ موسمیاتی تبدیلی پاکستان کے لیے وجودی خطرہ یعنی Existential Threat ہے۔ یہ خطرہ اس کے ماحول، انسانی زندگی کے تسلسل اور معیشت کو براہ راست متاثر کرے گا۔ اس تبدیلی کے سبب طوفانی سیلاب، غیر متوقع بارشیں، خشک سالی اور طوفان معمول بنتے جارہے ہیں۔ یہ ملک ماحولیاتی تبدیلی کے حوالے سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ممالک میں شامل ہے موسمیاتی تبدیلی پاکستان کی بقا کا مسئلہ ہے۔ گلوبل وارمنگ کے منفی اثرات کا سدِ باب پاکستان کی اہم ترجیحات میں شامل ہے۔ اگلے دس سالوں میں ورلڈ بینک اور آئی ایف سی پاکستان کو چالیس ارب ڈالر کے وسائل مہیا کریں گے نیز حکومت نے مقامی وسائل سے موسمیاتی تبدیلی کے اثرات سے نمٹنے کے لیے "گرین سکوک" کا اجرا بھی کیا ہے۔ یہ ایک مالیاتی آلہ ہے جس کا مقصد ماحولیاتی تحفظ کے لیے مختلف منصوبوں پر اسلامی اصولوں کے مطابق سرمایہ مہیا کرنا ہوتا ہے۔ پاکستانی حکومت یا کوئی ادارہ "گرین سکوک" جاری کرے گا تو اس سے حاصل ہونے والی رقم کو جنگلات لگانے، آبی بحران سے نمٹنے، صاف پانی کی فراہمی اور شمسی توانائی کے منصوبوں پر خرچ کرے گا۔

اس سال پاکستان میں گندم، کپاس اور چاول کی فصلوں کی پیداوار میں تیرہ فیصد کمی ہوئی ہے۔ پاکستان کو غذائی بحران، پانی کی قلت، بھارت کی آبی جارحیت، سیلابوں کی روک تھام اور موسمیاتی تبدیلیوں جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ نیشنل واٹر پالیسی 2018 حکومتِ پاکستان کی اہم دستاویز ہے کے تحت مختلف اہداف مقرر کیے گیے۔ ان اہداف میں عوام میں پانی کے استعمال کے لئے آگاہی مہم، آبی وسائل سے متعلق تحقیق کرنا، پاکستان واٹر کونسل کا قیام، قحط اور سیلابی صورتحال سے نمٹنے کے لیے اقدامات، ماحولیاتی بہاؤ، آلودگی پر قابو پانا، نئے ڈیمز بنانا، صوبوں کے درمیان پانی کے تنازعات کو حل کروانا، تمام صوبوں اور شعبوں میں پانی کی منصفانہ تقسیم اور پانی بچانے والی ٹکنالوجی کو فروغ دینا شامل

ہیں۔ گزشتہ سال پاکستان نے اپنے اہداف کے مطاب ۵۹ منصوبوں میں سے چوبیس منصوبے مکمل کیے ان منصوبوں پر ۲۹۵ ارب لاگت آئی اس طرح آیندہ سال کے لیے ایک سو چونتیس ارب روپے مختص کیے گئے تھے۔ ان میں سیلاب سے بچاؤ، پانی کا ذخیرہ اور تحفظ کے لیے اہم منصوبے شامل ہیں۔ بجٹ میں مہمند ڈیم کے لیے پینتیس عشاریہ سات ارب، دیامیر بھاشا ڈیم کے لیے بتیس عشاریہ سات ارب جب کہ کراچی میں ایک بڑے منصوبے بلک واٹر سکیم کے لیے دس ارب مقرر کیے گیے ہیں۔ بجٹ تقریر میں بھی کہا گیا کہ سندھ طاس معاہدہ معطل کر کے بھارت نے ایک طرح سے جنگ مسلط کی ہے۔ بھارت پانی کو بطورِ ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔ پانی پاکستان کی بقا کا ضامن ہے۔

موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے دریائے سندھ کو بھی نقصان ہو رہا ہے۔ انسانی غفلت اور سرگرمیوں کی وجہ سے دریائے سندھ ماحولیاتی آلودگی کا شکار ہے۔ ڈاکٹر محمد شعیب نے ادبیات اطفال میں پانی کی قلت اور اس کی تباہ کاریوں کے حوالے سے ایک ماحولیاتی کہانی "ندی کا انتقام" تحریر کی۔

"پیارے بچوں بہت دور ایک نیلی ندی کے قریب چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ گاؤں کے آس پاس لگے ہوئے سرسبز و شاداب درختوں کے پتوں سے تازہ تازہ ہوا چھن چھن کر آتی اور سارے ماحول کو صحت بخش بنا دیتی۔ نیلی ندی کے کنارے کنارے اُگی ہوئی ہری ہری گھاس سے بھیڑ بکریاں اور دوسرے جانور اپنا پیٹ بھرتے اور ندی کا صاف شفاف ٹھنڈا پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کرتے۔ یہاں کا موسم بھی پورا سال خوش گوار رہتا، زیادہ سردی پڑتی اور نہ گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا۔" [۱]

ایک شخص نے ندی کے دوسرے کنارے پر گاؤں کے لوگوں سے زمین خریدی۔ ندی سے بوتلوں میں پانی بھر کے شہر میں فروخت کرنے کے لیے فیکٹری بنائی۔ آخر میں ٹینکر بھر بھر کر شہر میں فروخت کرنے لگا یوں ندی کا پانی کم ہو گیا اور ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے سرسبز و شاداب علاقہ بنجر بن گیا۔ جس کی وجہ سے گاؤں میں بیماریاں پھیلنے لگی۔ ایک دن فیکٹری کے مالک کے بیٹے کی ندی سے لاش ملی۔ وہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور جاں بحق ہو گیا۔ اس طرح فیکٹری بند ہو گئی اور دوبارہ ندیاں بہنے لگی اور وہ گاؤں پھر سے سرشب سبز و شاداب ہو گیا۔

خانزادہ سمیع الوریٰ نے نظم آؤ بچو پیر لگائیں میں شجر کاری اور درختوں کے فوائد کے متعلق بہت سادہ اور مؤثر انداز میں بچوں تک اپنا پیغام پہنچایا۔ دنیا بھر کے ماہرین کی یہ ہی رائے ہے کہ جنگلات کی کٹائی، درختوں کی افزائش اور حفاظت کے متعلق عدم توجہی موسمیاتی تبدیلیوں کی بڑی وجہ ہے۔ موسمیاتی حدّت کا بنیادی حل بڑے پیمانے پر درخت لگانا اور جنگلات میں اضافہ ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہر سطح پر شجر کاری کی مہم کے بعد پودوں کی آبیاری اور مناسب دیکھ بھال کریں۔ درخت موسموں کو اعتدال میں رکھتے ہیں، آب و ہوا کو شفاف رکھتے ہیں، درخت آندھی، طوفانوں اور سیلابوں کا زور توڑتے ہیں۔ ان سے سیاحت کو فروغ ملتا ہے۔ درخت پرندوں اور جنگلی حیات کا

مسکن ہیں لیکن پاکستان میں صرف پانچ فیصد رقبے پر جنگلات ہیں۔ وفاق اور دیگر صوبوں کو بھی خیبر پختون خواہ کے ملین ٹری جیسے منصوبوں کی تقلید کرنی چاہیے کیوں کہ ماہرینِ ماحولیات کے مطابق ۲۰۵۰ء تک برِ صغیر کے بہت سارے علاقوں میں موسمی حدت سے انسان کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔

آؤ بچو پیڑ لگائیں　　اپنے ملک کا حسن بڑھائیں
تازہ ہوا فراہم کرنا　　سب سے اچھا کام ہے ان کا
بارش یہ برساتے ہیں　　موسم صاف بناتے ہیں
ان کے فوائد گنواؤں　　ڈر ہے کہیں بھول نہ جاؤں[۱۲]

اس نظم میں شاعر نے بچوں کو درخت لگانے کی اہمیت سے آگاہ کیا ہے۔ درختوں کے کئی فوائد ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہ آکسیجن پیدا کرتے ہیں جو انسانوں اور جانوروں کے سانس لینے کا ذریعہ ہے۔ یہ زمین کی ہوا کو صاف کرتے ہیں اور فضائی آلودگی کو قابو میں رکھتے ہیں۔ ان سے پھل اور لکڑی وغیرہ بھی حاصل کی جاتی ہے جو مختلف صورتوں میں انسانوں اور دیگر مخلوقات کے کام آتی ہے۔ درخت بہت سے پرندوں اور دیگر حیوانات کا مسکن ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کا موسم بڑے پیمانے پر درختوں پر منحصر ہے۔ ان سے دنیا کے رنگوں میں بھرپور قدرتی حُسن بھی قائم رہتا ہے۔ درختوں کے فوائد اتنے زیادہ ہیں کہ انھیں شمار کرنا مشکل ہے۔ سکولوں میں شجر کاری کا دن منایا جاتا ہے مگر بعد میں آبیاری اور حفاظت کی زحمت کم ہی کی جاتی ہے۔ اسی طرح شاہراہوں کی تعمیر اور شہری آبادیوں کی توسیع کے لیے درخت کاٹے جاتے ہیں مگر اس کے بدلے میں مزید درخت نہیں لگائے جاتے۔ زمین کو انسانوں کے رہنے لائق بنانے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر شجر کاری کی جائے۔ شاعر نے اس نظم میں بچوں کی شجر کاری کی طرف نہ صرف توجہ مبذول کرائی ہے بلکہ ان کو یہ شعور و آگہی بھی فراہم کی ہے کہ درخت لگانا اور ان کی حفاظت کرنا انسانی زندگی کی بقا کے لیے بہت اہم ہے۔

شہد بھی پیڑوں سے ملتا ہے　　جو ہر مرض کے لیے شفا ہے
دھوپ میں یہ دیتے ہیں سایہ　　ٹھنڈک ملتی ہے ہر لمحہ
پیڑوں سے پھل پاتے ہیں ہم　　شوق سے جن کو کھاتے ہیں ہم[۱۳]

درخت لگانے اور ان کی حفاظت کرنے کا شعور اجاگر کرنا اس دور کے اہم ترین امور میں سے ایک ہے۔ بیلن ٹری سونامی منصوبہ یہ شجر کاری کا منصوبہ ہے جو ماحولیاتی تبدیلیوں سے نمٹنے، حیاتیاتی تنوع کو فروغ دینے اور جنگلات کے تحفظ کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ اس منصوبے کا آغاز ۲۰۱۴ء میں پاکستانی حکومت کی قیادت میں ہوا اور پھر ایسے "ملین ٹری سونامی" کے نام سے پورے ملک میں پھیلایا گیا۔ اس منصوبے کو عالمی سطح پر پذیرائی ملی۔ کئی بین الاقومی اداروں

اور ماحولیاتی تنظیموں نے پاکستان کی اس پیش قدمی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ۲جون ۲۰۲۱ء یو این ای پی (UNEP) نے ایک بیان جاری کیا جس میں شجر کاری کے اس منصوبے کو ماحولیاتی بحران، موسمیاتی تبدیلی، گلوبل وارمنگ، اور حیاتیاتی تنوع کی کمی جیسے مسائل سے نمٹنے کا بہترین حل قرار دیا۔ پاکستان اُن چند ممالک کی فہرست میں شامل ہے جھنوں نے بہت کم وقت میں بون چیلنج (Bonn Challenge) کا ہدف حاصل کر لیا یعنی ایک ارب درخت لگانے کا ہدف مقرر کر کے ایسے مکمل کیا جیسے ماحولیاتی تحفظ کے لیے "ماڈل پروجیکٹ" کہا گیا اور اب مزید اس شجر کاری کی مہم کو وسعت دی جارہی ہے۔ اس سے نہ صرف ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں میں روز گار کے مواقع بھی فراہم کیے جائیں گے۔ اس ادرے نے اس منصوبے کو "عشرہ بحالی ماحولیاتی نظام Decad on Eco System Restoration 2021till 2030 کی بہترین مثال قرار دیا۔

ڈبلیو ای ایف (World Economic Forum) نے ۲۰۲۰ء میں اس منصوبے کے تحت پاکستان کو (Champions for nature community) میں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ "گرین لیڈر شپ" کے طور پر پذیرائی ملی۔ ڈبلیو ڈبلیو ایف (World wild life Fund) نے ۲۰۱۷ء میں پاکستان کے اس منصوبے کو قدرتی تنوع کی بحالی کے لیے اہم قرار دیا۔ اس رپورٹ میں جنگلی حیات، پرندوں اور مقامی جنگلات پر اس کے مثبت اثرات کو سراہا گیا۔

The Guardian برطانوی اخبار میں ۲۰۲۰ء میں پاکستان کے اس منصوبے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "پاکستان کا یہ منصوبہ دنیا بھر کے ممالک کے لیے قابلِ تقلید قرار دیا اور شجر کاری کی یہ مہم ماحولیاتی تحفظ کے لیے قابلِ تحسین ہے۔" پاکستان ماحولیاتی بحران سے نمٹنے کے لیے مثبت کردار ادا کر رہا ہے۔ خاص طور پر کرونا کے دوران "گرین جابس" کے تحت ہزاروں افراد کو روزگار مہیا کرنا قابلِ تعریف ہے۔

نظامِ شمسی میں سورج کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ چاند ستارے سورج کی وجہ سے روشن ہیں، چاروں موسم دن، رات صبح، شام اور زمین پر زندگی سورج کی بدولت ہے۔ شاعر افق دہلوی نے اپنی نظم "سورج" میں فطرت کے اس عظیم شاہکار کو موضوع بنایا ہے۔

بدلتا ہے یہ چاروں موسم ہمارے　　اس کی بدولت یہ دن رات، سارے
اس کی بدولت ہواؤں میں گرمی　　اس کی تمازت سے چلتی ہے اندھی
اسی سے نکلتی ہیں الفا شعاعیں　　اسی میں ہیں موجود بیٹا شعاعیں[۱۴]

شاعر نے سورج سے نکلنے والی شعاعیں الفا، گیما اور بیٹا کے انسانی زندگی پر مضر اثرات کا ذکر کیا ہے۔ ان شعاعوں کے مضر اثرات کو اوزون کی تہہ روکتی ہے مگر ماحولیاتی آلودگی کے سبب اس کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ اشرف المخلوقات نے سورج کی راہ میں بھی روڑے اٹکانے شروع کر دیے ہیں۔ یہ شعاعیں کینسر اور سانس کی بیماری کا سبب بنتی ہیں۔

آغا شاہد اکاشمیری کی نظم "یہ دنیا" میں انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ فطرت کے سبھی رنگ ان کے اشعار میں یکجا ہو جائیں اور بچے اپنی دنیا کے متعلق آگاہی حاصل کر سکیں۔

پہاڑ اور میداں، یہ چاند تارے　　یہ پھل، پھول، پودے یہ دل کش نظارے
گجر دَم جو پیڑوں پر گاتی ہیں چڑیاں　　خوشی کے ترانے سناتی ہیں چڑیاں[۱۵]

اس دنیا کی دلکشی کو فطرت کے مطابق قائم رکھنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا انسان نے پہاڑوں کو کھوکھلا اور فضاؤں کو آلودہ کر دیا ہے۔ یہ دنیا صرف انسانوں کی نہیں بلکہ تمام حیوانات، چرند پرند، نباتات، جنگلات، ہوا اور پانی سب کا مشترکا گھر ہے۔ یہاں سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔

ہوائیں، بادل، برسات، جگنو، تتلیاں، مور، پھول، ساون، دریا، سمندر، پرندے، حیوانات، نباتات سب انسان سے ناراض ہیں۔

تسنیم جعفری کی کہانی "بستی میں ہمیں بھی رہنے دو" میں وہ جانوروں سے محبت اور ہمدردی کا درس دیتی ہیں۔ انھوں نے جانوروں کے ساتھ بے رحمی سے پیش آنے والے ظالم انسان کی مذمت کی ہیں۔ مصنف کا موقف ایک سیکولر کبیری سماج کی خواہش سے عبارت ہے کہ زمین سب کا مشترکا گھر ہے۔ اس کہانی میں مالک اپنے بندر پر تشدد کرتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں بندر کے لیے ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس کے مالک کو پیسے دیتے ہیں یہ تماشا روز ہوتا ہے ایک دن بندر مار سے تنگ ہو کر چڑیا گھر بھاگ جاتا ہے اور تمام قید جانوروں اور پرندوں کو آزاد کروالیتا ہے۔ تمام جانور اور پرندے چڑیا گھر سے فرار ہو کر جنگل لوٹ جاتے ہیں اور انسانوں سے چھٹکارہ پاکر خوشی کے نعرے لگاتے ہیں۔

> "جنگل آچکا تھا سب خوشی سے نعرے لگاتے، اچھلتے کودتے جنگل میں داخل ہو گئے جب آخری جانور بھی اندر آگیا تو ہاتھی نے آگے بڑھ کر دروازہ پکڑا اور مڑ کر دوڑ جاتے گوالے کو ایک نظر دیکھا جو اب ایک نقطے کی صورت نظر آرہا تھا۔ ہاتھی مسکرایا، اس نے زیرِلب دعا دی اور خود بھی جنگل میں داخل ہو کر اس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔"[۱۶]

تسنیم جعفری فطرت کے تحفظ اور ہماری ذمہ داریوں کے متعلق بچوں کی راہنمائی کی ہے۔ کہ دنیا صرف انسانوں کی نہیں ہے بلکہ سب کی ہے۔ یہ دنیا فطرت کے دیگر مظاہر کی وجہ سے حسین ہے۔ مگر ظالم انسان نے سب کا یہاں رہنا محال کر دیا ہے۔ چڑیا گھر میں بچے پرندوں اور جانوروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن یہ ہماری ذمے داری ہے کہ بچوں میں شعور بیدار کریں کہ یہ بے زبان جانور بے خطا ہیں۔ انھیں قید کرنا ظلم ہے۔ فضا کی وسعتوں میں اُڑان بھرنے والے پرندے ایک چھوٹے سے قفس میں قید کر لیے جاتے ہیں۔ تنگ چڑیا گھروں کی نسبت سفاری پارکس ہونے چاہیے۔ وائلڈ لائف پارکس جہاں جنگلی جانور آزاد گھومتے ہیں جیسے تزانیہ کا سرنگتی نیشنل پارک، جنوبی افریقہ کا کروگر نیشنل پارک، کینیا کا ماسابائی پارک، یو اے ای کا دبئی سفاری پارک، پاکستان کا سفاری پارک لاہور اور بھارت کا رانتھمبور سفاری پارک وغیرہ۔ اسلام آباد میں لوہی بھیر پارک بھی ایک وائلڈ لائف پارک ہے۔ جہاں شیر قدرے آزاد ماحول میں گھومتے ہیں مگر باقی جانور اور پرندے قیدی ہیں۔ یہ پارک متعلقہ انتظامیہ اور حکومت کی بے توجہی کا شکار ہے۔

ہُدہُد کا شمار دنیا کے خوب صورت پرندوں میں ہوتا ہے اس کا تعلق پرندوں کے خاندان پاسیڈی Picidae سے ہے۔ حضرت سلمان علیہ السلام کو تختِ بلقیس کی خبر دینے والے پرندے کا مسکن جنگلات یا درختوں کے ذخیرے میں ہوتا ہے۔ یہ اپنی تین انچ لمبی چونچ سے درختوں کے تنے پر سوراخ کر کے درخت دشمن کیڑا کھاتا ہے۔ لکڑی پر مسلسل ضربیں لگانے کی وجہ سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ اس لیے ہُدہُد کو کھٹ بڑھی بھی کہا جاتا ہے۔ طوبیٰ صدیقی کی کہانی "کھٹ بڑھی" اسی پرندے کے متعلق ہے۔ ایک دوست گیلی مٹی سے ہُدہُد کا ماڈل بناتا ہے۔ دوستوں کو دیکھا کر اس کا تعارف "کھٹ بڑھئی" کے نام سے کرواتا ہے۔ مگر دوست کہتے ہیں کہ کھٹ بڑھئی تو لکڑی کا کام کرنے والے انسان کو کہتے ہیں۔ ان بچوں کی اُستانی کھٹ بڑھی کا تعارف کرواتی ہے۔

"کھٹ بڑھئی درختوں کے تنوں میں سوراخ بنا کر ان میں موجود کیڑے
کھاتا ہے اور یوں درخت کو کئی بیماریوں سے محفوظ بناتا ہے۔"[۱۷]

یہ کہانی بہت دل چسپ ہے مگر آنے والے تیس چالیس سال بعد موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے کتنی قسم کے پرندے، تتلیاں اور جگنو معدومیت کا شکار ہو جائیں گئے اور اُس وقت کے بچوں کو تصویروں، کھلونوں اور مٹی سے بنے پرندے اور جانوروں کے ماڈل دیکھا کر ماضی کے قصے سنائے جائیں گے، بلکل طوبیٰ صدیقی کی کہانی "کھٹ بڑھئی" کی طرح، راولپنڈی اور اسلام آباد جیسے شہروں اور مضافات میں طوطے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اب چڑیوں کا چہچہا کہیں نظر نہیں آتا روایتی چڑیوں کی تعداد بہت کم ہو چکی ہے۔ ہُدہُد، مینل گنٹھ گاؤں میں کم کم نظر آتے ہیں۔ کنکریٹ کے

گھر، درختوں کے کٹاؤ کے سبب پرندے بے گھر ہو چکے ہیں۔ لہلہاتے ب کھیتوں کی جگہ کالونیاں بن چکی ہیں۔ پرندے بھی غذائی قلت کا شکار ہیں۔ موسمیاتی شدت اور فضائی آلودگی کے باعث پرندوں کی نسل کشی ہو رہی ہے۔

شجر کاری، شہروں میں گرین بیلٹ کا قیام، ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے کے لیے ضروری اقدامات آج کے انسان کی ذمے داری ہے تاکہ فطرت کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ گھر کی چھتوں پر مصنوعی آشیانوں اور دانا پانی کا انتظام اور پودے بے گھر پرندوں کے لیے تحفظ اور افزائش کا سبب بن سکتے ہیں۔

ادبیاتِ اطفال کے کہانی نویس ایم۔ اے خالد کی کہان "تم نہ سمجھو گئے" فطرت کو لاحق خطرات اور ہماری ذمہ داریوں کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک جنگل میں بہت سے جانور بیمار ہو جاتے ہیں۔ جس میں جنگل کے بادشاہ شیر کا بچہ منّا بھی شامل ہوتا ہے۔ اس بیماری سے بہت سے جانور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بھالو بیمار جانوروں کا علاج کرتے ہیں۔ ایک ذہین بندر ناریل کے پیالے میں جنگل میں بہنے والی ندی کا پانی لاتا ہے جیسے ڈاکٹر بھالو سونگ کر جانوروں کو بتاتا ہے کہ ندی کا پانی زیریلہ ہو چکا ہے۔ الّو خبر لاتا ہے۔ شہر کی صنعتوں سے خارج ہونے والا زیریلہ پانی ندی کے پانی میں شامل ہو رہا ہے۔ سب جانور شہر کے باہر جمع ہو کر احتجاج کرتے ہیں اور بن مانس اپنی بلند آواز میں خطاب کرتا ہے کہ:

> ے "اے انسانیت کے علمبر داروں! کیا ماحول پر ہمارا کوئی حق نہیں؟ کیا صاف پانی اور صاف ہوا صرف تمہارے لیے ہیں؟ انسان نہ سہی جاندار تو ہیں۔ ہمارے بھی احساسات تم جیسے ہیں۔ ہمارے گھروں میں جو صفِ ماتم بچھی ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ہمارے سیکڑوں بچے مر چکے ہیں۔"[۱۸]

پھر شہر کا میئر اس زیریلے پانی کی ترسیل کو بند کر دیتا ہے۔ کے ایم خالد نے حکومتی حلقوں اور صعنتوں کے مالکان کے ضمیر کو جھنجھورنے اور اُنھیں اُن کی ذمہ داریوں کے متعلق آگاہ کرنے کی سعی کی ہے۔ نیز کے۔ ایم خالد نے بچوں میں شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ماحولیاتی آلودگی کی وجوحات کیا ہیں اور اس سلسلے پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے۔ احتجاج کرنے والے جانوروں کے ایک سرکردہ سرگرم کارکن بن مانس نے انسانوں کے متعلق کہا کہ انسانوں کی لاپرواہی اور دولت کی ہوس کی وجہ سے جنگلی حیات کو نقصان پہنچا اور کئی بچے زہریلے پانی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔

> ے "لہذا انسانوں کا گھناونا پن جانوروں کی حوانیت سے زیادہ گھناؤنا ہے۔"[۱۹]

سمندر کے نیلے ذخائر اب آلودہ ہوتے جا رہے ہیں۔ آبی آلودگی ایک خاموش مگر تباہ کن ماحولیاتی بحران ہے۔ یہ بحران آبی آلودگی، آبی حیات، ماحولیاتی توازن اور خود انسان کی زندگی کے لیے خطرہ ہے۔ سمندری پانی میں زیریلے

مواد اور پلاسٹک کا شامل ہونا ہے ماحولیاتی آلودگی کو بڑھا رہا ہے۔ پلاسٹک کے سبب سمندری حیات کو شدید خطرہ ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر کوڑے سے بھرے دو ہزار سے زائد ٹرکوں کے برابر پلاسٹک جھیلوں، دریاؤں اور سمندر میں پھینکا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتیرش (Antonio Guterres) کا کہنا ہے کہ:

"پلاسٹک کی پیداوار معدنی ایندھن کے باعث ہوتی ہے اور جتنا پلاسٹک بناتے ہیں اتنا ہی ایندھن جلتا ہے اور ماحولیاتی بحران کو بھی اتنا ہی شدید خطرہ ہے۔"[۶۰]

پلاسٹک کے موٹے ذرات پانچ میٹر تک انسانی جسم میں داخل ہوتے ہیں اور نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے سبب پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں سے لے کر سمندر کی تہہ تک ماحولیاتی آلودگی پھیل جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد شعیب کی کہانی طوطے کے پیغام میں پلاسٹک بیگ کے بے تحاشا استعمال اور اُس کے مضمرات کا ذکر کیا ہے۔ اک چرواہا اپنے بولنے والے طوطے کے ہمراہ بکریاں فروخت کرنے کے لئے اپنے خوب صورت سرسبز شاداب گاؤں سے شہر جاتا ہے۔ شہر میں بہنے والا آلودہ پانی اور پلاسٹک کے تھیلوں میں ڈال کر سڑکوں پر پھینکنے والے کچرے میں سبزیوں کے پتے بکریاں کھا کر ہلاک ہو جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے چرواہا صدمے سے دوچار ماہرِ امراض حیوانات کے پاس جاتا ہے۔ ماہرِ حیوانیات چرواہا اور کچھ جمع ہونے والے شہریوں کو پلاسٹک کے تھیلوں کو ماحولیاتی آلودگی کا ایک بڑا سبب قرار دیتا ہے۔ طوطا سب کی گفتگو کو غور سے سنتا ہے۔ وہ اپنے مالک چرواہ کے کہنے پر یہ پیغام لے کر اُڑ جاتا ہے اور جگہ جگہ پہنچاتا ہے کہ:

"اے دنیا والوں دنیا کو موت سے بچاؤ، پلاسٹک کے تھیلوں کا استعمال بند کرو پلاسٹک کے شاپنگ بیگ میں موت ہے۔ ان میں زہر ہے شاپنگ بیگ کا استعمال بند کرو۔"[۶۱]

پلاسٹک بیگ پانی کی نکاسی میں رکاوٹ کا باعث ہیں کوڑا کرکٹ میں موجود پلاسٹک کو جلانے سے زیریلہ دھواں سانس اور کینسر جیسی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ لہذا حکومتوں اور عوام ہر دو کا یہ فرض ہے کہ پلاسٹک تھیلوں کے استعمال کو ترک کر دیں۔ دودھ وغیرہ لینے کے لیے برتن اور دیگر اشیا کے لیے کاغذ گتے یا کپڑے کے تھیلیوں کا استعمال کری۔ فرزانہ روحی اسلم کی کہانی "چار اطخ چار بطخ" میں بطخیں بھی فضائی آلودگی اور آبی آلودگی کے سبب نوحہ کناں ہیں:

"پانی میں مچھلیاں بہت کم ہو گئی ہیں پانی کی صفائی ہو جائے تو مچھلیاں بھی سکھ کا سانس لے سکیں گی۔ اب انھیں تیر کر ذرا مزہ نہیں آتا، پانی بہت گندا ہے کوڑا کرکٹ سے بھرا ہوا اور بدبو سے سانس لینا محال ہے ورنہ کچھ سال پہلے خوب غوطے لگا لگا کر تیرتیں، آپس میں دوڑ لگاتیں، غرض پانی میں ایک ہنگامہ برپا رہتا۔"[۶۲]

آبی آلودگی سے بچنے کے لیے بلیو اکانومی کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ بلیو اکانومی سے مراد معاشی سرگرمیاں ہیں جو دریاؤں، جھیلیوں، سمندروں اور دیگر آبی وسائل پر انحصار کرتی ہے۔ جس کا مقصد آبی حیات اور نیلے ذخائر کو نقصان پہنچائے بغیر معیشت کو مضبوط بنایا جاسکے۔ بلیو اکانومی صرف معیشت تک محدود نہیں بلکہ یہ ماحولیاتی تحفظ اور آبی زندگی کے احترام پر بھی زور دیتی ہے۔ اس کے مطابق سمندری وسائل کو استعمال کریں مگر نیلے ذخائر کو آلودہ نہ ہونے دیں۔ ماہی گیر مچھلیوں کا بے دریغ شکار نہ کریں۔ سمندری حیاتیات کا تحفظ یقینی بنانا اس کا مقصد ہے۔ بلیو اکانومی ایسے اقدامات کو سراہاتی ہے جو سمندری پودوں کی بحالی کا کام کریں، مینگرووز جیسے ساحلی جنگلات کی حفاظت کو یقینی بنانا کیوں کہ اس سے آبی حیات محفوظ رہتی ہیں اور ساحلی کٹاؤ نہیں ہوتا۔

پاکستان نے آبی آلودگی سے بچنے کے لیے ایک منصوبہ " منصوبہ زندہ دریائے سندھ لیونگ انڈس" شروع کیا۔ اقوامِ متحدہ کے ادرے یو. این. ای. پی (United Nation Environment Program) اور ادرہ خوراک وصحت ایف. اے. او (Food and Agriculture Organization of the United Nations) کی راہنمائی اور زیرِ قیادت شروع کیے گئے اس منصوبے کا مقصد ماحول کا تحفظ ہر براعظم اور سمندر کو ماحولیاتی انحطاط کو روکنے کے لیے مناسب اقدامات کرنا ہے۔ ان منصوبوں کے تحت ہماری زمین پر موجود ایک ارب ایکڑ رقبے کی ماحولیاتی بحالی کے لیے کوشش کی جاری ہے۔ دریائے سندھ بھی انھی منصوبوں کی کڑی ہے۔ اس منصوبے کے سبب حیاتیاتی تنوع کی حفاظت، فضائی آلودگی میں کمی، آبی ذرائع کے استعمال میں توازن کے قیام، آلودگی میں کمی اور سماجی معاشی ترقی میں کامیابی حاصل ہوگی۔

دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا دریا ہے۔ بیشتر صنعتوں اور زراعت کا دارومدار اس دریا پر ہے۔ نیز پاکستان کی ایک بڑی آبادی کا انحصار دریائے سندھ پر ہے۔ پاکستان میں ایک عرصے تک خدمات سرانجام دینے والے جولین ہارنیس (Julien Harneis) جو اقوامِ متحدہ کے سابق رابطہ آفیسر تھے اُن کے مطابق پاکستان کے لوگ قریباً چھے ہزار سال سے دریائے سندھ کے طاس میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ طاس ایک وسیع و عریض علاقہ ہے یہ پاکستان، چین، افغانستان اور بھارت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طاس کی اہمیت معیشت، زراعت اور پانی کی فراہمی کے لیے بہت اہم ہے۔ ابھی بھی پاکستان کی پچاس فیصد آبادی کا انحصار اسی دریا پر ہے۔ اس دریا کا طاس چھے سو اٹھاٹھ پرندوں، ممالیہ کی ایک سو پچانوے انواع اور مچھلیوں کی ایک سو پچاس سے زائد انواع کا مسکن ہے۔ دنیا کی ایک نایاب مچھلی انڈس ڈولفن اور دیگر بائیس انواع کو معدومیت کے خطرے کا سامنا ہے۔ موسم سرما میں ہر سال دریائے سندھ لاتعداد اقسام کے ہجرت کرنے والے مسافر پرندوں کی میزبانی کرتا ہے۔

منصوبہ دریائے سندھ ایک کثیر فریقی کوشش ہے تاکہ اس دریائے کی صحت کی بحالی کو ممکن بنایا جاسکے۔ اس منصوبے میں اقوامِ متحدہ حکومت سول سوسائٹی اور اس دریا کے مستقبل کو تحفظ دینے والے تمام ممالک شامل ہیں یہ منصوبہ پاکستان کے مستحکم موسمیاتی مستقبل کا ضامن ہے۔ پاکستان میں انحطاط کا شکار ہوتے دریائے سندھ کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لیے اس منصوبے کو ماحولیاتی نظام کی بحالی کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ کے سات بڑے اور اہم منصوبوں میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ منصوبہ پاکستان کے موسمیاتی مستقبل میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اس پانی کے وسائل کا پائیدار انتظام اور پانی کے استعمال میں توازن قائم کرنا، ماحولیاتی آلودگی میں کمی، حیات اور ماحولیاتی تحفظ، معاشی اور سماجی ترقی مین مدد ملے گی۔ اس منصوبہ کے تحت تیرہ لاکھ پچاس ہزار ہیکٹر رقبہ پہلے ہی بحال کیا جاچکا ہے۔ اقوامِ متحدہ تکنیکی اور مالی معاونت کے تحت ۲۰۳۰ء تک دریائی طاس کے ۲۵ ملین ہیکٹر رقبے کو بحال کرنے میں مدد ملے گی۔ انگر اینڈرسن اقوامِ متحدہ کے اہم ادارے یو. این. ای. پی (UNEP) برائے ماحولیاتی پروگرام کی نائب ناظمِ اعلیٰ کا کہنا ہے کہ موسمیاتی تبدیلی کی وجہ سے پاکستان کو موسمیاتی حادثات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کو تنہا برداشت کرنا کسی بھی ملک کے لیے ممکن نہیں۔ لہذا زندہ دریائے سندھ جیسے منصوبوں کی مالی اور تکنیکی معاونت دنیا اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا بے حد اہم ہے یہ نہ صرف پاکستان بلکہ خطے کے لیے امید اور استحکام کا باعث بنے گا۔

موسمیاتی تبدیلی کے اثرات کو محدود کرنے اور حیاتیاتی تنوع کے فروغ اور حفاظت کے لیے مقامی لوگ اور دیگر سول سوسائٹی کے رضاکار بھی ان کوششوں میں برابر کے شریک ہیں ورلڈ ایسٹورشن فلیگ شپ کی حیثیت سے اس اہم منصوبے کو کسی خطے یا ملک کے لیے ماحولیاتی نظام کی بحالی نیز طویل مدتی موثر اقدامات کی بہترین مثال قرار دیا ہے۔ البتہ اس منصوبے پر ثابت قدمی، لگن اور دیانتداری سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کئی سالوں کے موسم کی اوسط آب و ہوا موسمیاتی تبدیلی کہلاتی ہے اور موسمیاتی تبدیلی اُسی اوسط درجہ حرارت میں طویل مدتی تبدیلی ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے مسلسل درجہ حرارت بڑھ رہا ہے جس کے سبب سیلاب، خشک سالی، گرمی کی شدت، سطح سمندر میں اضافہ اور سمندری حدت جس کے باعث لوگوں کے زندگیاں اور روزگار متاثر ہوئے۔ ماحول میں بہت بڑی مقدار میں پائی جانے والی گرین ہاؤس گیسوں کی وجہ سے پورے کرہ ارض پر فضا، سمندر اور زمین میں تبدیلیاں آئی۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ:

> "انسان گرین ہاؤس گیسیز فضا میں داخل کرکے قدرتی گرین ہاؤس کے اثر کو بڑھاوا دے رہا ہے جس کے سبب درجہ حرارت بڑھ رہا ہے اس عمل کو عالمی تپش یا ماحولیاتی تبدیلی کہا جاتا ہے"۔ [۴۳]

دنیا کے مستقبل کو تشکیل دینے والے دو اہم ستون ماحولیاتی تحفظ اور آب و ہوا کی تبدیلی ہے دنیا بھر میں زمین، سمندر، ہوا، بارش، جنگلات اور صحرا میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ دنیا بھر میں جنگلی حیات معدومیت کے خطرے سے دوچار ہیں جب کہ فضا میں نمی میں اضافے کی وجہ سے مچھر کی افزائش میں اضافہ ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں مچھر سے پیدا ہونے والی بیماریوں مثلاً ملیریا اور ڈینگی جیسے جان لیوا امراض کی وجہ سے انسانی زندگی کو شدید خطرات لاحق ہیں اس طرح تحقیق کے مطابق پانچ برسوں میں درجہ حرارت میں صرف ایک ڈگری اضافے کی وجہ سے ذہنی امراض میں دو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ان تحفظات کو مد نظر رکھتے ہوئے ابیات اطفال میں ارسلان اللہ خان کی نظم "گرمی" عنوان سے شامل کی گئی ہے:

اف یہ گرمی اور پسینا　　مشکل میں ہے سب کا جینا
کیسے نکلیں گھر سے باہر　　لے لیتے ہیں چھتری سر پر
جب بھی نکلو گھر سے باہر　　لے لو کوئی کپڑا سر پر
دن کو تم باہر نہ جاؤ　　شام کو جا کر سودا لاؤ[۶۴]

اس نظم میں شاعر نے شدید گرمی میں بچوں کو مشورہ دیا ہے کہ گھر سے سر پر کپڑا رکھ کر جائیں یا چھتری کا استعمال کریں ٹھنڈی چیزیں اور تربوز کا شربت پیئے۔ دن کو گھروں میں رہیں اور شام کو سودا سلف لانے کے لیے باہر جائیں کیونکہ انسان اور خاص طور پر بچے فطرت کا سب سے خوبصورت اور عظیم مظہر ہیں۔ گرمیوں میں عموماً بچے ہیٹ سٹروک، ڈی ہائیڈریشن اور بہت سی پیٹ کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں جو بعض اوقات جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ شاعر نے اس نظم میں فطرت کے متعلق شعور اور ہماری ذمہ داریوں کو متعلق بچوں کو خبر دار کیا ہے۔ مزید براں زمین کے ماحول میں بہت سی گیسیز قدرتی طور پر موجود ہوتی ہیں یہ شمسی حرارت کو جذب کر کے فضا میں روک لیتی ہے اور واپس خلا میں خارج کر دیتی ہیں۔ کچھ خاص گیسیز جیسے فلورینیٹڈ گیسیز، واٹر وپیر، نائٹرس آکسائیڈ، می اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر کے زمین کی فضا کو گرم کر دیتی ہیں۔ ان متعین شدہ قدرتی گیسیز کی موجودگی زمین کو رہنے کے قابل درجہ حرارت مہیا کرتی ہیں۔ ان گیسیز کو "گرین ہاؤس گیسیز" جب کہ اس عمل کو گرین ہاؤس ایفیکٹ کہا جاتا ہے۔ سرد موسم میں ٹھنڈ سے بچنے کے لیے لحاف کا استعمال کرتے ہیں جو ہمیں سردی سے بچاتا ہے بلکل اسی طرح گرین ہاؤس گیسیز زمین کے آس پاس لحاف کی طرح حرارت کو اپنے اندر رکھتی ہیں اگر یہ لحاف بہت موٹا ہو جائے تو زمین کے درجہ حرارت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ ہی ماحولیاتی مسئلہ ہے۔ انسانی سرگرمیوں کی بدولت زمین کے درجہ

حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے جیسے عالمی حدت کہتے ہیں اس سے موسم غیر متوازن ہو جاتا ہے، گرمی سے گلیشیرز تیزی سے پگھل رہے ہیں اور ان کے پگھلنے سے سطح سمندر میں اضافہ ہو رہا ہے، جنگلات اور حیاتیاتی تنوع کو نقصان پہنچ رہا ہے، سیلاب اور قحط کے خطرات بڑھ گئے ہیں، قدرتی نظام متاثر ہونے سے پیداوار میں کمی کے باعث غذائی بحران پیدا ہو رہا ہے، گرمی کی شدت سے انسانی صحت متاثر ہو رہی ہے، پانی کی قلت بڑھ رہی ہے مچھر اور جراثیموں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر یہ گرین ہاؤس گیسیز معتدل رہیں تو زمین کو رہنے کے قابل ہے لیکن جب یہ گیسیز حد سے تجاوز کر جائیں تو زمین گرم ہو جاتی ہے جو جانداروں کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ گرین ہاؤس گیسیز میں سب سے زیادہ منفی اثرات رکھنے اور حرارت گیری کے اسباب کی وجہ ہے اس کی مقدار خطرناک حد تک چار سو دس حصے فی ملین ہو چکی ہے۔ عالمی درجہ حرارت صنعتی انقلاب سے اب تک ایک اعشاریہ دو ڈگری بڑھ چکا ہے۔ اس طرح دنیا کی صورت حال بگڑ جائے گی۔ سبزہ زار، ریگستان، سرسبز و شاداب پہاڑ چٹیل ہو جائیں گئے، کچھ ملک ڈوب جائیں گئے، کچھ ریگستان بن جائیں گئے اور زمین کے باسی سر چھپانے کے لیے جگہ تلاش کر رہے ہوں گئے۔

گرین ہاؤس ایفیکٹ کے بچاؤ کے اقدامات کرنے ہوں گئے زیادہ سے زیادہ درخت لگانے ہوں گئے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کرتے ہیں اور گرمی کی شدت کو کم کرتے ہیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ اور سائیکل کا استعمال کرنا ہو گا کیوں کہ ذاتی گاڑیاں، ٹرک، ہوائی جہاز اور ریل گاڑیاں سب ایندھن سے چلتے ہیں جس کے سبب کاربن ڈائی آکسائیڈ کی پیداوار میں ایک چوتھائی حصہ اسی نقل و حمل کے ذرائع کا نتیجہ ہے۔ ہوا، پانی اور شمسی توانائی کے ذریعے بجلی پیدا کرنی پرے گی غیر ضروری بجلی استعمال کرنے سے گریز کرنا پرے گا۔ کیمیائی کھادیں نائٹرس آکسائیڈ خارج کرتی ہیں قدرتی کاشتکاری کی طرف توجہ دینا ہو گی ۔ قوانین پر عمل درآمد کرنے کے ساتھ ساتھ عوام میں ماحولیاتی شعور بیدار کرنا ہو گا۔ بچوں کے لیے اسکولوں میں ماحول دوست نصاب اور مختلف سرگرمیاں منعقد کرنے کا رجحان بڑھانا ہو گا جیسے بجلی بچانا، درخت لگانا، صفائی کا خیال رکھنا اور اپنے گھر زمین سے محبت بیدار کرنا وغیرہ۔ ان میں ماحولیاتی شعور بیدار کرنا بہت ضروری ہے اگر بچپن سے ان میں فطرت سے متعلق شعور پیدا کیا جائے تو ہی وہ فطرت سے محبت کریں گے اُن کو بتائیں کہ زمین ہم سب کا مشترکا گھر ہے اس کو خوبصورت، صاف اور محفوظ رکھیں۔ فطرت جیسے پہاڑ، سمندر، دریا، صحرا، ندیاں، ہوا اور درخت سب ہمارے دوست ہیں ان سب کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔

سائنس دان اس بات پر متفق ہیں اور خبر دار کر رہے ہیں کہ آئندہ بیس سالوں میں موسمی تبدیلی کے اثرات بہت بھیانک ہوں گئے۔ سیلاب اور تباہ کن طوفان سے نظامِ زندگی متاثر ہو گا ہر خطے کا درجہ حرارت خطرناک نقطے کو چھو

لے گا۔ اگر اس مسلے پر توجہ نہ دی گئی تو موسموں اور آب و ہوا کی غیر یقینی صورت حال پیدا ہونے کی جہ سے موسم ناخوش گوار ہو جائیں گئے لہذا اس وقت تمام دنیا کی حکومتوں اور اقوامِ عالم کو ایک دوسرے سے تاریخی تعاون کی ضرورت ہو گی۔

فریدہ حفیظ نے کہانی "ندی کے سفر" کی خوب صورت انداز میں روداد بیان کی ہے۔ ندیاں کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ دراصل اس کہانی میں پانی سے متعلق قدرت کے اس نظام اور عمل کا ذکر کیا گیا ہے جس کے تحت گرمی کی شدت سے گلیشئرز پگھلتے ہیں۔ یہ پانی آبشار سے ندی، پھر ندی سے دریا اور دریا سے زمینوں کو سیر اب کرتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ دھوپ کی حدت سے سمندر اور جنگلات میں موجود پانی بھاپ کی صورت میں فضا میں بلند ہوتا ہے۔ اس طرح بادل بنتے ہیں اور پھر یہی کالی گھٹائیں ہواؤں کے سنگ برکھا بن کر برستی ہیں۔ جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بارش ہوتی ہے تو وہ درجہ حرارت کی شدید کمی کی وجہ سے برف یا گلیشئرز کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور صدیوں سے ان پہاڑوں پر گلیشئرز تہ در تہ جما ہوا ہے۔ پانی کی نقل و حرکت کا یہ سلسلہ زمین پر اسی طرح جاری رہتا ہے۔ فریدہ حفیظ نے اس کہانی کے ذریعے بچوں قدرت کے اس خوبصورت نظام سے روشناس کروایا ہے۔ کہانی میں سب سے پہلے بچوں کو گلیشئرز کے متعلق آگاہی فراہم کی جاتی ہے۔

> "بہت اونچے اونچے پہاڑوں پر ہر وقت برف جمی رہتی ہے۔ وہاں درخت نہیں اگتے نہ پھول، نہ پودے۔ گھاس کا ایک تنکا بھی نظر نہیں آتا۔ نہ درخت نہ جھاڑیاں نہ پھول، بس برف ہی برف۔ سفید دودھیا رنگ کی چادر ہر طرف بچھی ہوئی ہوتی ہے۔ ابھی پہلی برف پگھل نہیں پاتی کہ مزید برف پڑ جاتی ہے"۔[۲۵]

پاکستان میں کوہِ ہندو کش ہمالیہ اور قراقرم کی بلند و بالا پہاڑوں کے سلسلے کو گلیشرز کا گھر کہا جاتا ہے۔ گلیشرز برف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہوتا ہے جو مناسب حدت کی وجہ سے آبشاروں، ندیوں اور دریاؤں میں پانی کی صورت میں جانداروں اور زمینوں کو سیر اب کراتا ہوا سمندر کے پانی میں ضم ہو جاتا ہے۔ یوں آبشار، ندیاں اور دریا سال بھر پانی کی خاص مقدار میں بہتے رہتے ہیں۔ جیسے جیسے گلیشرز پگھلتے ہیں برف باری ہوتی ہے، جھیلوں، دریاؤں اور زیرِ زمین پانی کے ذرائع کو بھرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ پانی یہ ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھتے ہیں ان کے سبب زمین کا درجہ حرارت متوازن رہتا ہے۔ لیکن عالمی حدت اور ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے گلیشرز شدید متاثر ہو رہے ہیں اور تیزی سے پگھلنے کے باعث خشک سالی، سیلاب اور ماحولیاتی خطرات کا باعث بن رہے ہیں۔ فریدہ حفیظ کہانی میں لکھتی ہیں کہ:

"جب درجہ حرارت میں تھوڑی سی بھی زیادتی ہوتی ہے تو برف پگھل جاتی ہے۔ ذرا سی گرمی بھی برف کو پگھلاتی ہے۔ برف پگھلتی ہے تو پہلے قطرے ڈھلوان کی طرف پانی کی دھاروں کی صورت میں ایک دوسرے کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ جوں جوں نیچے کی طرف آتے ہیں تو دھاریں چھوٹی چھوٹی آبشاروں میں بدل جاتی ہیں۔ بلند پہاڑوں سے اترنے والے یہ آبشار بھی دودھ کی مانند سفید اور جھاگ دار ہوتے ہیں۔"

گرین لینڈ کی آئس شیٹ یعنی برفانی چادر نے زمین کی سطح کا 1.2 فیصد اور انٹارکٹکا کی برفانی چادر 8.3 فیصد حصے تک پھیلی ہوئی ہے جب کہ گلیشرز سے زمین کا 0.5 فیصد حصہ ڈھکا ہوا ہے جو تیزی سے غائب ہو رہا ہے۔ درجہ حرارت جس تیزی سے بڑھ رہا ہے اس کے سبب سطح سمندر پچیس سینٹی میٹر سے بتالیس سینٹی میٹر تک بڑھ سکتی ہے اس میں تقریباً نصف حصہ گلیشرز کے پانی کا ہو گا اس سے نہ صرف پانی کی بلند ہو رہی ہے بلکہ زمین پر موسموں کی شدت، قحط، سیلاب اور زرعی مسائل جنم رہے ہیں۔ سمندر کی سطح بلند ہونے سے ساحلی علاقوں میں سیلاب، طوفانی لہروں، ساحلی کٹاؤ کے خطرات بڑھ جاتے ہیں نیز پینے والے میٹھے پانی کے ذرائع میں کھارا پانی شامل ہو کر استعمال کے قابل نہیں رہتا۔

ورڈ ریسورسز انسیٹیوٹ ڈبلیو آر آئی یہ ادارہ امریکہ میں واشنگٹن ڈی سی کا تھنک ٹینک ہے اس ادارے کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے قریب چار سو مقامات ایسے ہیں جہاں شدید آبی مسائل یا پانی کی کمی کا سامنا ہے جس میں پاکستان بھی شامل ہے۔ پانی ہمارے سیارے میں ستر فیصد تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس ستر فیصد پانی میں صرف تین فیصد پانی پینے کے قابل ہے جو ماحولیاتی آلودگی اور بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ اس زمین پر بسنے والے کم از کم ایک ارب انسانوں کو پانی کی کمی کا سامنا ہے اور 2.7 فیصد آبادی جزوی طور پر پانی کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ یعنی 2.7 ارب آبادی سال میں ایک ماہ صاف پینے کے پانی سے محروم ہے۔ پانی کی کمی کے حوالے سے ۲۰۱۴ء میں ایک سروے کیا آبی سروے رپورٹ کے مطابق ہر چار میں سے ایک شہر آبی مسائل دوچار ہے۔ بھارت کا شہر بنگلور دنیا کے چھے شہروں میں سرِ فہرست ہے بنگلور شہر کی آبادی میں بے حد اضافہ ہوا ہے یہ صعنت اور ٹکنالوجی کا مرکز ہے اس شہر کی جھیلیں بری طرح آلودہ ہو چکی ہیں پانی کی فراہمی اور ترسیل کا نظام اس قدر خراب ہو چکا ہے اس کا نصف پانی ضائع ہو جاتا ہے، گھروں تک پہنچنے والا پانی آلودہ ہونے کے ساتھ ساتھ مضرِ صحت بھی ہے اور نکاسی کا انتظام پانی کی فراہمی سے زیادہ بدتر ہے۔

چین کا شہر بیجینگ دو کروڑ آبادی پر مشتمل ہے جب کہ پانی کی فراہمی صرف ایک لاکھ پینتالیس ہزار میٹر ہے۔ اس شہر کے گردونواح میں قحط سالی ہے اعداد و شمار کے مطابق اس شہر کا چالیس فیصد پانی بھی زرعی اور صنعتی پیداوار کے

لئے کارآمد نہیں پینا تو دور کی بات ہے۔ پانی کی کمی پورے چین کو ہے دنیا کے بیس فیصد آبادی والے ملک میں پانی صرف سات فیصد ہے۔ ماحولیاتی آلودگی اور موسمیاتی تبدیلی نے چین جیسے ترقی یافتہ ملک کو بھی پنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔

مصر کے شہر قاہرہ کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے ایتھوپیا اور یوگنڈا سے شروع ہونے والا دریا نیل خرطوم سے ہوتا ہوا مصر میں داخل ہو کر قاہرہ شہر سے گزرتا ہے۔ یہ دنیا کا قدیم اور تاریخی دریائے نیل مصر کے ستانوے فیصد پینے کے پانی کی ضروریات فراہم کرتا ہے۔ دریائے نیل جو بڑی آبادی والے شہر قاہرہ سے گزرتا ہے آلودہ ہوتا جارہا ہے حالاں کہ نیل بہت گہرا شفاف اور نیلگوں دریا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے مطابق مصر میں آلودہ پانی کی وجہ سے بیماریوں اور اموات میں اضافہ ہورہا ہے۔ قاہرہ کو ۲۰۲۵ء کے آخر تک پینے کے پانی کی شدید قلت کا سامنا ہو سکتا ہے. روس دنیا کا ایسا ملک ہے جہاں پانی بڑی مقدار میں موجود ہے۔ روس کی صنعتی ترقی نے صاف اور تازہ پانی کو آلودہ کر دیا ہے یہاں پانی کے زیرِ زمین ستر فیصد ذخائر ہیں اب یہاں کا پینتیس فیصد پانی پینے کے قابل نہیں رہا اور حفظانِ صحت پر پورا نہیں اترتا۔

۲۰۳۱ء تک ترکی کو صاف پانی کی کمی کا سنگین مسئلہ درپیش ہو گا۔ استنبول کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے جہاں گرم موسم میں پانی کی شدید کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں پانی کے ذخیرے میں تیس فیصد کمی ہو چکی ہے۔ اس طرح لندن شہر کا اسی فیصد پانی دریا سے آتا ہے گریٹر لندن اتھارٹی کے مطابق ۲۰ء تک پانی کا مسئلہ ایک سنگین مسئلہ ہو گا۔

عالمی ادرے کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے دس ممالک ایسے ہیں جن کو ۲۰۲۵ء میں پانی کے شدید بحران کا سامنا ہو گا۔ ان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ پانی کی قلت کے باعث یہ ممالک غذائی بحران کا شکار ہو جائیں گئے نیز یہ غذائی بحران اقتصادی بد حالی کا سبب بنے گا۔ مختلف فصلوں کی پیداوار میں پچاس فیصد کمی ہو جائے گی۔ ان ممالک میں لبنان، افغانستان، شام، ترکی، پاکستان وغیرہ شامل ہیں۔ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے زیرِ زمین پانی کی سطح انتہائی کم ہو جائے گی یہ جنگلی حیات اور بنی نوانسان کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ زیرِ زمین خطرے کی گھنٹی کا مشاہدہ مشرق وسطی اور شمالی افریقی ممالک میں کیا جارہا ہے۔ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے پانی کی طلب میں اضافہ ہورہا ہے۔ حب طلب حد سے بڑھ جائے تو مختلف قوتیں میدانِ جنگ میں آجاتی ہیں ماہرین پہلے سے یہ بتا چکے ہیں کہ آنے والے وقت کی جنگیں آبی مسئلے پر ہوں گی۔ پاکستان چوبیس کروڑ آبادی کا ملک ہے۔ یہ ایک بڑے آبی بحران کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پاکستان کی مجموعی پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت صرف تیس دن کی ہے جب کہ عالمی اوسط ۲۲۰ دن ہے۔ پانچ براعظموں میں پچاس سے زائد ممالک پانی کے مسئلے پر ایک دوسرے سے نبرآزما ہیں۔ ایتھوپیا دریائے نیل پر ڈیم تعمیر کر رہا ہے جیسے "گریٹ رینیسانس" کہتے ہیں اس کا شمار دنیا کے بڑے ڈیموں میں کیا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر پر مصر

نے احتجاج کیا اور دونوں ملکوں کے درمیان شدید کشیدگی رہی۔ حال ہی میں دونوں کا آپس میں پانی کی تقسیم پر معاہدہ ہوا ہے۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان لفظوں میں دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا معاہدہ ۱۹۶۰ء میں عالمی بینک کی مدد سے ہوا۔ جس کے تحت ہندوستان کو تین نہری دریا بیاس، ستلج اور راوی جب کہ تین مغربی دریا جہلم، سندھ اور چناب پاکستان کے حصے میں آئے۔ دونوں ممالک کے درمیان ایک مشترکہ انڈس واٹر کمیشن بنایا گیا۔ ہر سال دونوں ممالک کے نمائندے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ ہندوستان نے کچھ عرصہ پہلے ان دریاؤں پر کشن گنگا، رتلے اور فامی ڈیم بنائے جس پر پاکستان نے شدید احتجاج کیا۔ سات مئی ۲۰۲۵ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا اور ساتھ ہی اس عظیم معاہدہ کو توڑنے کا اعلان بھی کر دیا یہ معاہدہ ابھی تک معطل ہے۔ پانی کی طلب اور ضروریات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حکومتِ پاکستان نے اس اقدام کو جنگ کے مترادف قرار دیا ہے۔ ہندوستان کی حکومت نے سندھ طاس معاہدہ کو بحال نہ کرنے کا اعلان کر رکھا ہے۔

فرزانہ روحی نے کہانی "چار اطخ چار بطخ" تحریر کی ہے۔ اس کہانی میں بطخوں کو ماحول دشمن انسانوں سے شکایت ہے کہ انھوں نے ندیوں اور تالابوں کو کوڑا کرکٹ ڈال کر اتنا بدبودار اور زہریلہ بنا دیا ہے کہ اب بطخیں اس میں تیر کر لطف اندوز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ زہریلہ پانی پینے کے قابل ہے۔ اداس بطخیں ماضی کو یاد کرتی ہیں کہ:

> "جب نہ دنیا گندی تھی، اور درختوں کے سائے بھی کم نہ تھے نہ زمین کروٹیں لیتی تھی نہ دریا کا پانی کم ہوتا تھا، جگہ جگہ سبزہ تھا، جب پرندے درختوں پر اور حیوانات زمین پر سکون سے رہتے تھے۔ بادل اعتدال میں برستے تھے، پانی لطیف تھا، جنگلات تھے ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ آسمان آگ نہیں برساتا تھا۔"[۲۶]

اسی اثنا میں آسمان سے ایک خلائی مخلوق ظاہر ہوئی اور تالابوں میں کوڑا کرکٹ پھینکنے والوں کو اٹھا کر لے گئی۔ خوف زدہ ہو جانے کی وجہ سے اب دریا اور تالاب انسان کی سحر انگیزی سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور فطرت میں پھر سے رعنائیاں لوٹ آتی ہیں۔ اچھے شہری کی ذمہ داری ہے کہ وہ تالابوں اور دریاؤں کو صاف ستھرا رکھیں۔ غیر مہذب شہریوں کو جہاں خالی پلاٹ نظر آتا ہے یا تالاب وہیں کچرا پھینک دیتے ہیں۔ شاپر، کیلے چھلکے، پلاسٹک اور شیشے کی بوتلیں اور ڈبے، استعمال شدہ سگریٹ شاہراؤں پر جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ فرزانہ روحی کی یہ کہانی فطرت سے متعلق ہماری ذمے داریوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

"آدمی نے بوری کو دریا کے کنارے الٹ دیا اس میں ٹھونسا ہوا کوڑا کرکٹ باہر نکلا اور اسے تالاب میں پھینک دیا اور اس کے سبب فضا میں ناگوار بو پھیل گئی۔ خلائی مخلوق نے پوچھا یہ کون ہے بطخوں نے بتایا یہ ہی وہ بدصورت آدمی ہیں جن کی وجہ سے فضا آلودہ ہے، ہر طرف بدبو اور دھواں ہے"[۲۷]

گرد و غبار، آلودہ پانی اور زہریلے دھویں کی آمیزش سے فضا میں تحلیل ہونے والی آلودگی "سموگ" نہ صرف ماحول بلکہ موسمیاتی نظام، زراعت، معیشت اور انسانی صحت پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ سموگ دو الفاظ "دھواں" اور "دھند" سے مل کر بنا ہے جو فضائی آلودگی کی ایک قسم ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں جس کو فوٹو کیمیکل سموگ اور سلفورس سموگ کہتے ہیں۔ کلاسیکل سموگ سلفر ڈائی آکسائیڈ، دھویں، کوئلے کے ذرات اور نمی کے امتزاج سے بنتی ہے جب کہ فوٹو کیمیکل سموگ سورج کی روشنی میں فیکٹریوں، گاڑیوں اور صنعتی ایندھن سے نکلنے والے کیمیائی ردِ عمل سے بنتی ہیں۔ سموگ کا لفظ پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں استعمال کیا گیا۔ پہلی بار یورپ اور امریکہ کو صنعتی ترقی کی بدولت فضائی آلودگی کا سامنا کرنا پڑا۔ لندن کو ۱۹۰۰ء میں اس نے اپنی لپیٹ میں لیا۔ پاکستان میں موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی صوبہ پنجاب کے مختلف شہر خاص طور پر لاہور اور فیصل آباد میں سموگ کی مقدار انتہائی خطرناک سطح پر پہنچ چکی ہے۔ یہ سارا سال فضا میں موجود رہتی ہے لیکن موسم سرما میں شدت اختیار کر جاتی ہے۔ سموگ کے حوالے سے لاہور شہر کا نام معتدد بار دنیا کے آلودہ ترین شہروں میں سہر فہرست رہا۔ اس کے مضر اثرات کے متعلق یونیورسٹی آف شگاگو میں ۲۰۲۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق اگر لاہور شہر میں ماحولیاتی آلودگی پر قابو پائے جائے تو اس شہر کے باشندوں کی اوسط عمر چار سال بڑھ سکتی ہے جب کہ پاکستان کے ماحولیاتی آلودگی کا شکار شہریوں میں رہنے والوں کی اوسط عمر نو ماہ تک کم ہو رہی ہے۔ سموگ انسانی صحت کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ آنکھوں میں جلن، سانس کی بیماریاں، کھانسی نزلہ، زکام سے ہر عمر کے لوگ متاثر ہو رہے ہیں لیکن اس کے سبب بچے، بوڑھے اور مریض سب سے زیادہ شکار ہوئے ہیں۔ سموگ پھیپھڑوں کی جان لیوا بیماریوں اور کینسر کا بھی باعث بن رہی ہے۔ ہندوستان کا شہر دہلی بھی سموگ کی زد میں ہے ایک تحقیق کے مطابق یہاں تین سال سے چودہ سال کے اڑتالیس بچوں کے پھیپھڑے کالے (Black Lungs) ہو چکے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فضائی آلودگی کی یہ قسم کس حد تک خطرناک ہے۔ ایئر کوالٹی انڈیکس فضائی آلودگی میں موجود کیمیائی اجزا، مٹی کے ذرات، مختلف کیمیائی گیسیز اور کچھ ذرات جو نظر نہیں آتے ان کی مقدار معلوم کرنے کا پیمانہ ہے۔ مقدار ناپنے کے اس معیار کو پارٹیکولیٹ میٹر (پی ایم) بھی کہا جاتا ہے۔ ایئر کوالٹی انڈیکس کے سلسلے میں عالمی ادارہ صحت نے کچھ راہنما اصول وضع کیے ہیں جس کے مطابق کسی علاقے یا شہر کی فضا میں موجود پی ایم ذرات کی تعداد پینتیس مائیکرو گرام فی مکعب میٹر سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے۔

اس پیمانہ کے مطابق لاہور شہر میں ایئر کوالٹی کئی مرتبہ تین سو سے تجاوز کر چکی ہے۔ جس کے باعث تعلیمی اداروں کو بند کرنا پڑا۔ فصلوں کی باقیات جلانے پر پابندی عائد کی گئی۔ دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں اور اُن صنعتوں کے خلاف کاروائی کی گئی جن کا دھواں سموگ کا باعث بن رہا تھا۔ لاہور کے ہسپتالوں میں سموگ کارنر قائم کیے گئے۔ شاہراؤں کو دھویا گیا۔ یہ اقدامات بہت مناسب ہیں مگر عارضی ہیں۔ ماحولیات سے وابستہ مسائل کو حل کرنے کے لیے طویل المدت منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ یہ ایک مسلسل اور صبر آزما جنگ ہے جو مسلسل اقدامات کا تقاضا کرتی ہے۔ حکومت پنجاب کی طرف سے سموگ پالیسی بنائی گی اور جو اس کی خلاف ورزی کریں اُن کے متعلق لاہور ہائی کورٹ نے از خود نوٹس لیا اور پاکستان کے ادارہ برائے ماحولیاتی تحفظ کو سخت ہدایات جاری ہے کہ کوالٹی انڈیکس کے متعلق جامع حکمت عملی بنائی جائے اور سموگ کمشن کا قیام عمل میں لایا جائے۔

غیر موثر آگاہی مہم بھارت میں جلائی جانے والی فصلیں جن کا دھواں پاکستان میں داخل ہوتا ہے نیز بے ترتیب ترقیاتی منصوبہ جات بھی سموگ کے مضر اثرات کا سبب ہیں۔ انسانی حقوق کی عالمی تنظیم نے بھی لاہور کی فضائی آلودگی کے متعلق ایک ہنگامی رپورٹ جاری کی ہے۔ اس کے مطابق ہر شہری کی جان کو خطرہ ہے۔ پاکستان میں لاہور، گوجرنوالہ ،فیصل آباد، ملتان ، قصور ،راولپنڈی اور اسلام آباد جیسے شہر سموگ سے متاثر ہو رہے ہیں ۔2024ء میں پنجاب گورنمنٹ نے "گرین لاک ڈاؤن" کا تجربہ کیا تمام تعلیمی ادارے بند کر دیے گئے اور پچاس فیصد سرکاری ملازمین نے گھروں میں بیٹھ کر آن لائن سرکاری کام کیا۔

> ؎"لاہور میں دن نکلتا ہے مگر ہوا میں زہر سا بھرا معلوم ہوتا ہے سانس کے ساتھ نادیدہ کرچیاں گلے کو کاٹتی ہوئی پھیپھڑوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی ایک شاخسانہ ہے جس کی ہمیں پرواہ نہیں ہے، ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ آنے والی نسلوں کو علم سے آراستہ کرتے ہوئے ہر وہ بات جس کا تعلق اُن کے عملِ زندگی سے ہو اس سے اُن کو بے خبر رکھنا ہے۔"[۲۸]

انسانی پھیپھڑے ایک اندازے کے مطابق ۵۰ سے ۱۸۰(Air Quality Index)اے کیو آئی تک کی فضا آسانی سے برداشت کر سکتے ہیں مگر ملتان اور لاہور میں یہ مقدار ۲۰۰۰ تک جا چکی ہے۔ اس سے بوڑھے بچے جوان سب ہی متاثر ہو رہے ہیں۔ لاہور کی فضا میں سلفر، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ہائیڈروجن کی مقدار میں حد سے زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ لاہور کی فضا میں صرف ایک دن سانس لینا دن میں ۵۰ سگریٹ پینے سے زیادہ خطرناک ہے اور مضرِ صحت ہے۔

باغوں ، تعلیمی اداروں، قدیم تہذیب و تمدن کو اپنی گود میں سمیٹالاہور شہر اب رہنے کے قابل نہیں رہا۔ماہرینِ ماحولیات کے مطابق شہر میں کم از کم ۶۵ لاکھ رواں دواں رہتی ہیں جس سے خارج ہونے والا زہریلا دھواں ماحول کو آلودہ کر رہا ہے۔ناقص پٹرول ڈیزل کی خرید وفروخت پر بھی قابو پانا بے حد ضروری ہے۔ فیکٹری کارخانوں پر کروڑوں روپے خرچ کرنے والے مالکان کارخانہ لگا لیتے ہیں مگر زہریلے دھویں اور فضلات پر اقدامات کرنے سے کتراتے ہیں۔سوک سنس(Soak Sense)نہ ہونے کے برابر ہے۔یہ سینسر پر مبنی ایک تکنیک ہے۔اگر کسی شہر میں بارش ہو رہی ہو تو اس کی مدد سے معلوم ہوتا ہے کہ کس جگہ پانی جذب ہو رہا ہے، نکاسی کے مسائل کہاں کہاں درپیش ہیں، بارش کن علاقوں میں نہیں ہوئی اور بارش کے دوران زمین کی نمی کی سطح کیا ہے۔یہ سب معلومات سوک سنس خودکار طور پر بتائے گا۔لاہور اور سیالکوٹ میں بڑے پیمانے پر ٹائر جلائے جاتے ہیں۔ٹائر میں ربڑ،کاربن، دھاتیں، کیمیکل اور پلاسٹک ہوتے ہیں یہ فضائی آلودگی کا سبب بنتے ہیں۔یہ عمل انسانی صحت کے لیے بھی نقصان کا باعث ہے۔حالاں کہ ماحولیاتی قوانین کے تحت یہ انتہائی غیر قانونی حرکت ہے۔UNEP اور WHO نے پاکستان سے درخواست کی ہے کہ وہ ٹائر جلانے پر پابندی عائد کرے۔پاکستان میں PEPA ایکٹ کت تحت ٹائر جلانا غیر قانونی ہے ترقی یافتہ ممالک ٹائر جلانا ماحولیاتی جرم ہے پاکستان اور انڈیا پر سموگ وار دنیا کے لیے کوئی نیا مشاہدہ نہیں اس سے قبل بھی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک بھی سموگ کا شکار ہوئے۔مگر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اُن ممالک نے سموگ پر کیسے قابو پایا یہ ہی حکومت اور باشعور شہریوں کی ذمہ داری ہے۔

۲۰۱۳ء چین کے شہر بیجنگ جو چین کا دارلحکومت بھی ہے سموگ کی زد میں آگیا لیکن چینی قیادت نے صعنتی ترقی کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی آلودگی کے سلسلے میں مناسب اقدامات کیے۔چین کی یہ کوشش کامیاب رہی اور اس کا شہر شنگھائی بھی دنیا کے آلودہ شہروں میں شمار ہوتا ہے۔چین نے یہاں سموگ فری ٹاور کی تنصیب بڑے پیمانے پر کی تاکہ ہوا کو سموگ سے پاک کیا جائے۔ میکسیسیکو سٹی میں نے سموگ سے نپٹنے کے لیے ہوا کو صاف کرنے کے سلسلے میں ریئل ٹائم فضائی نگرانی کا کامیاب تجربہ کیا۔یہ شہر کی فضائی آلودگی پر نظر رکھتا ہے۔کئی علاقوں میں سمارٹ ٹاور نصب کیے جو زہریلے ذرات اور گرد و غبار کو فلٹر کر کے صاف ہوا مہیا کرتا ہے اس ٹکنالوجی کو "CityTree" کہتے ہیں۔ ان اقدامات سے شہر میں کاربن مونو آکسائیڈ،لیڈ اور سلفر ڈائی آکسائیڈ جیسے زہریلے اجزا کی مقدار میں کمی آئی فضا صاف ہوگئی اور شہریوں کی صحت بحال ہوگئی۔

۲۰۱۶ء میں برطانیہ نے ایئر کوالٹی انڈیکس کی پڑتال کے لیے ایک غیر روایتی دل چسپ طریقہ اختیار کیا انھوں نے کبوتروں پر پولوشن میٹر یعنی ہلکے سینسرز والے بیک پیکس پہنائے تاکہ فضامیں آلودگی کی مقدار کا اندازہ لگایا جاسکے اس منصوبے کو"Pigeon Air Patrol "کانام دیا گیالندن کے کبوتر فضائی سپاہی بن گئے۔

پولینڈ نے دیگر اقدامات کے ساتھ غیر معیاری آلودگی اور دھواں پھیلانے والے چولہوں پر پابندی لگادی۔ جنوبی کوریا کے شہر سیون میں ساٹھ ہزار سے زائد ماحول کو صاف کرنے والے کنڈینسنگ بوائلرز متعارف کروائے جو نقصان دہ گیسوں کے اخراج کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ توانائی کی بچت بھی کرتے ہیں۔ بھارت کا شہر دہلی جو آلودگی کے حوالے سے دنیا کے آلودہ ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے ۴ جنوری ۲۰۱۶ میں دہلی کی انتظامیہ نےOdd.Even Scheme کا آغاز کیا۔ یہ ایک ٹریفک ریگولیشن سکیم ہے یعنی گاڑیوں کے جفت اور طاق نمبرز کے حوالے سے اوقات مقرر کر دیے تاکہ ٹریفک کے بہاو کو آدھا کیا جاسکے۔ اس کا مقصد ٹریفک کم کرنے سے گاڑیوں سے خارج ہونے والی زہریلی گیسیز کو ہوا میں شامل ہونے سے بچانا ہے تاکہ فضائی آلودگی پر قابو پائے جاسکے۔

موسمیاتی تبدیلی اور سموگ کے تباہ کن مضر اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ قلیل المدتی پالیسیوں، پنجاب ماحولیاتی ایکٹ ۱۹۹۷ء، وفاق اور دیگر صوبوں میں موجود قوانین پر سختی سے عمل دارآمد کیا جائے۔ ماسک کا استعمال، عوام میں اس سلسلے میں شعور کی بیداری کی مہم، مصنوعی بارش اور ہسپتالوں میں ڈیسک قائم کرنا بے حد ضروری ہے۔ پٹرول اور ایندھن کے معیار کو یقینی بنانا، دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں پر پابندی اور وقت کے ساتھ ساتھ بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کو فروغ دینے سے ماحولیاتی آلودگی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ دھواں اور کیمیائی زہریلہ فضلہ خارج کرنے والے کارخانوں، فیکٹریوں کے خلاف کاروائی اور آئندہ شہروں سے دور انھیں منتقل کرنا جیسا کہ گریٹ سموگ آف لندن کے بعد وہاں کی حکومت نے کیا تھا۔ برطانیہ کی حکومت، میکسیکو اور چین کے تجربات سے پاکستان اور اسموگ سے متاثرہ ممالک کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ شجر کاری، جنگلات کا تحفظ، زرعی زمینوں پر رہائشی کالونیاں بنانے پر پابندی اور شہری آبادکاریوں میں گرین بیلٹ اور تمام دستیاب زمینوں پر زیادہ سے زیادہ درختوں کی افزائش ضروری اقدام ہیں جس کے تحت سموگ اور فضائی آلودگی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

۱۹۴۳ء میں امریکہ کے شہر سان فرانسکو میں دوپہر کے وقت شہریوں نے ایک سیاہ بادل اٹھتے ہوئے دیکھا۔ لوگوں نے اندازہ لگایا کہ بارش برسنے والی ہے لیکن بادل جب قریب آئے تو لوگوں کو محسوس ہوا کہ بادل برسانے والے بادل نہیں بلکہ یہ بادل تو زحمت بن کر آئے ہیں کیوں کہ اُن کی آنکھوں میں شدید جلن شروع ہو گی۔ یہ دور دوسری جنگِ عظیم کا تھا۔ شہریوں نے اسے کیمیائی حملہ سمجھا۔ اس طرح برطانیہ کے شہر لندن میں بھی جب شہری صبح بیدار ہوئے تو

ہر طرف گہرے دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ حدِ نگاہ صفر ہو چکی تھی نظامِ زندگی درہم برہم ہو گیا۔ لوگ دن بھر بے چین رہے رات تک لوگوں کو علم ہو چکا تھا یہ عام دھند نہیں ہے۔ وہاں کے لوگوں کے لیے یہ نیا مشاہدہ اور تجربہ تھا۔ آئندہ چار دنوں میں ہزاروں افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ اس گہرے دھوئیں سے لوگوں کا سانس بند ہونے لگا۔ گاڑیاں اور ریل گاڑیاں رک گئی ۔ سرکاری ادارے بند ہو گئے۔ تجارتی اور سرکاری سرگرمیاں بلکل ختم ہو گی۔ شہر میں سناٹا تھا۔ ایمبولینس کی آوازیں شہریوں کو بے چین کر دیتی تھی۔ ہسپتال مریضوں اور مردوں سے بھر چکے تھے۔ شہر ویران اور قبرستان آباد ہو گئے۔ پانچویں دن شدید بارش ہوئی اور فضا سے آلودہ دھند ختم ہو گی۔ اس دوران بارہ ہزار افراد ہلاک اور قریب ڈیڑھ لاکھ افراد ٹی بی، دمّے، آشوبِ چشم اور نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئے۔ ماہرینِ ماحولیات نے تحقیقی رپورٹ میں بتایا کہ فضا میں روزانہ کی بنیاد پر ہزاروں ٹن مضرِ صحت سموگ پارٹیکلز پیدا ہو رہے ہیں اور یہ ایک طویل عرصے سے انسانی غفلت اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ لندن کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا جس کی وجہ سے جنگلات کٹ گئے ،ہریالی ختم ہو گی، جھیلیوں ،تالابوں اور ندیوں کا پانی گدلہ ہو گیا،، لہلہاتے کھیت، فصلوں کی جگہ ہاؤس سکیموں نے لے لی جس کے باعث فطرت اور ماحول کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ یہ صنعتی انقلاب کا دور ہے۔ بے شمار کارخانے اور فیکٹریاں وجود میں آئے ان سے خارج ہونے والا دھواں اور کیمیائی فضلہ فضائی آلودگی کا سبب بنا۔ گاڑیوں اور بھاپ سے چلنے والے انجن کا دھواں فضائی آلودگی کا سبب بنا تھا۔ عوام اُس دھوئیں کے مضر اثرات سے اُس وقت عوام آشنا نہیں تھے اور لندن کی فضا بے حد آلودہ ہو گی۔ ہوا میں آکسیجن کی مقدار کم ہوتی چلی گی اور یہ سلسلہ ۱۹۵۲ء تک چلتا رہا۔ دھند (Fog) اور دھوئیں (Smoke) کے مرکب کو سموگ کا نام دے دیا گیا اور اس بڑے سانحہ کو "گریٹ سموگ آف لندن" کا نام دیا گیا۔ گریٹ سموگ آف لندن کے بعد پارلمنٹ نے ایک قانون "گرین ائیر ایکٹ" پاس کیا جس کے تحت لندن میں کوئلے کے استعمال پر پابندی عائد کی گی۔ فیکٹریوں اور کارخانے کے مالکان کو شہر سے دور مفت جگہ فراہم کی گی تا کہ یہ شہر سے باہر منتقل ہو سکیں ۔ سردیوں میں بجلی سستی کر دی گی تا کہ کوئلہ کے استعمال کو روکا جا سکے۔ پاور پلانٹس لندن سے باہر منتقل کر دیے گئے۔ پٹرول کے اعلیٰ معیار کو یقینی بنایا گیا۔ زرعی زمینوں پر تعمیرات اور درخت کاٹنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ معیاری پبلک ٹرانسپورٹ میں اضافہ کیا گیا تا کہ پرئیویٹ گاڑیوں کے استعمال کو کم کیا جا سکے۔ اس قانون کی منظوری کے بعد اس پر سختی سے عمل کیا گیا اور تقریباً چار سال کے اندر لندن کو سموگ فری قرار دے دیا گیا۔

انسان کے بہت سارے منفی اعمال ایسے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے ارد گرد کا ماحول بیمار اور آلودہ ہو گیا ہے یعنی ماحولیاتی آلودگی کا سبب خود انسان ہیں ادبیاتِ اطفال کے کہانی نویس ایم۔ اے خالد کی کہانی "تم نہ سمجھو گئے" میں بن مانس اپنی بلند آواز میں ماہرِ ماحولیات سے خطاب کرتا ہے کہ:

"تمہارے شہر سے کیمیکل اور غلاظت سے بھری ایک ندی ہمارے جنگل کی صاف اور شفاف ندی میں آکر گرتی ہے۔ پس ہم ہر اتنی مہربانی کرو کہ اپنی ندی کو ہماری ندی سے ہٹالو! ہمیں وہ ندی بخش دو جو صدیوں سے ہماری زندگی ہے۔"[۲۹]

یہ دنیا صرف انسانوں کی نہیں بلکہ تمام حیوانات، چرند پرند، نباتات، جنگلات، ہوا اور پانی سب کا مشترکا گھر ہے۔ یہاں سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ ہوائیں، بادل، برسات، جگنو، تتلیاں، مور، پھول، ساون، دریا، سمندر، پرندے، حیوانات اور نباتات سب انسان سے ناراض ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ اعزاز باقر،مترجم،نوم چومسکی کے خطبات ماحولیاتی بحران (لاہور:مشعل بکس ،۲۰۲۱ء)،ص۲۵۔

۲۔https://www.azquotes.com/author/19049-George_Monbiot ،جارج مانبیاٹ،بتاریخ،۲فروری۲۰۲۵ءبوقت ۲:۳۴۔

۳۔https://jimcarroll.com/2019/11/ ،جارج بانبیاٹ،بتاریخ،۵فروری ءبوقت ۱۲:۵۵۔

۴۔https://www.monbiot.com/2015/01/06/the-child-inside/ جارج بانبیاٹ،بتاریخ ۲جون۲۰۲۵ءبوقت ۱۰:۳۱

۵۔https://www.monbiot.com/2015/01/06/the-child-inside ،جارج بانبیاٹ،بتاریخ ۲جون۲۰۲۵ءبوقت ۱۲:۳۴

۶۔ اعزاز باقر،مترجم،نوم چومسکی کے خطبات ماحولیاتی بحران (لاہور:مشعل بکس ،۲۰۲۱ء)،ص۱۱۵۔

۷۔ادریس بابر،"تتلی"اور لڑکی مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۲(جولائی تا ستمبر۲۰۱۷ء)،ص۲۵۔

۸۔جان کاشمیری،"جگنو"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد،ش۷(اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۸ء)،ص۱۷۔

۹۔ تسنیم شریف،"مانی اور طوطا" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد ،ش۸ (جنوری تا جون۲۰۱۹ء)،ص۷۷۔

۱۰۔ڈاکٹر محمد شیعب خان۔"زمین کا مقدمہ"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۱۷(اپریل تا جون۲۰۲۱ء)،ص۳۱۔

۱۱۔فریدہ حفیظ"ندی کا سفر"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۶(جولائی تا ستمبر۲۰۱۸ء)،ص۳۷۔

۱۲۔ سمیع الوریٰ،"آو بچوں پیر لگائیں" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آبادش۲۱((اپریل تا جون ۲۰۲۱ء)،ص۶۶

۱۳، سمیع الوریٰ،"آو بچوں پیر لگائیں" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد ش ۲۱((اپریل تا جون ۲۰۲۱ء)،ص ۶۶

۱۴۔افق دہلوی،"سورج"مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد،ش۲۶(جولائی تا ستمبر ۲۰۱۸ ء)۔ص ۲۶۔

۱۵۔ آغا شیدا کشمیری ،"یہ دنیا "مشمولہ سہ ماہی ادبیات اطفال اسلام آباد ،ش۲۱(اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص ۲۶۔

۱۶۔ تسنیم شریف،"بستی میں ہمیں بھی رہنے دو "مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۲۰(جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء)،ص ۵۹۔

۱۷۔طوبیٰ صدیقی "کھٹ بڑھئی"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش ۲۲(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۲ء)،ص ۱۰۰۔

۱۸۔کے ایم خالد "تم نہ سمجھو گئے"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش ۲۲(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۰ء)،ص ۷۸۔

۱۹۔ایضاً،ص ۷۸۔

۲۰۔https://news.un.org/ur/story/2025/07/18492 ،اقوامِ متحدہ رپورٹ،بتاریخ ۴ ستمبر ۲۰۲۵ء بوقت ۵:۲۵۔

۲۱۔ڈاکٹر محمد شعیب خان۔"طوطے کا پیغام"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش ۲۲(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۲ء)،ص ۵۶۔

۲۲۔فرزانہ روحی اسلم "چار اطخ چار بطخ"مشمولہ سہ ماہی ادبیاتَ اطفال،ش ۳(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء)،ص ۴۹۔

۲۳۔ https://www.bbc.com/urdu/science-54106922 ،اُردو سائنس،بتاریخ ۳ جون ۲۰۲۵ء،بوقت ۱۲:۳۴

۲۴۔ ارسلان اللہ خان ،"گرمی" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد ش ۱۲ (اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)،ص ۳۲۔

۲۵۔ فریدہ حفیظ "ندی کا سفر" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال، ش۶ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۸ء)، ص۳۷۔

۲۶۔ فرزانہ روحی اسلم "چار اطخ چار بطخ" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتَ اطفال، ش۳ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء)، ص۴۹۔

۲۷۔ فرزانہ روحی اسلم "چار اطخ چار بطخ" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتَ اطفال، ش۳ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء)، ص۴۹۔

۲۸۔ آمنہ مفتی، "لاہور کھو رہا ہے"۔ https://www.bbc.com/urdu/pakistan-59362888 ۔بتاریخ ۷ مارچ ۲۰۲۵ء بوقت ۱۰:۳۳

۲۹۔ کے ایم خالد "تم نہ سمجھو گئے" مشمولہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال، ش۲۲ (جولائی تا ستمبر ۲۰۲۰ء)، ص۷۸۔

ماحصل

فطرت کے معنی قدرت، کائنات اور مایہ کے ہیں۔ فطرت کے متعلق قدیم ترین نظریات تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ارسطو، روسو، نطشے، مارکس، جیمس ڈیوس اور وائٹ ہیڈ کے ہاں مل جاتے ہیں۔ ادب میں فطرت (Nature) سے مراد وہ سب کچھ ہے جسے انسان نے نہیں بنایا۔ دھرتی، امبر، آفتاب و ماہتاب، ستارے، کہکشاں، چشمے، آبشاریں، دریا، سمندر، پہاڑ، نباتات، حشرات، حیوانات، طیور، ہوائیں، سحاب، موسم، خاموشی، سکون، انسانی جبلتیں وغیرہ یہ سب فطرت ہے۔ ادب میں فطرت انسانی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور روحانیت کے حوالے سے یہ خدا کے قرب کا ذریعہ ہے۔

روایتی ادب میں فطرت کو خوب صورتی، سکون اور روحانیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر برکھا اداسی یا پاکیزگی کی علامت جب کہ بہار کو محبت اور امید کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ پت جھڑ نے پریشانی، جدائی، زوال اور موت کی علامت کے طور پر ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ غرض یہ کہ فطرت انسانی جذبات اور خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

جدید ادب اور ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں اب فطرت کو صرف مظاہر قدرت یا صرف دل کشی اور خوب صورتی کے طور پر نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کا سیاسی اور اخلاقی پہلو بھی زیر نظر رکھا جاتا ہے۔ نیز انسانی غفلت اور عدم توجہی کو ماحولیاتی بربادی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ ادب میں فطرت کا موضوع قدیم ہے لیکن حالات اور زمانے کے ساتھ ساتھ فطرت کا مفہوم اور تعریف بھی تبدیل ہوتی رہی ہے۔

ماحولیاتی تبدیلی دور حاضر کے سب سے بڑے مسائل میں سے ایک ہے۔ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آئندہ فطرت اور انسان کی بقا کو مستقبل میں شدید خطرات لاحق ہوں گئے۔

لہذا بچوں میں فطرت سے متعلق شعور بیدار کرنا بے حد ضروری ہے فطرت اور ماحولیاتی تبدیلیوں، فطرت کو لاحق خطرات اور اس سلسلے میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ بچوں کی کہانیوں کا لازمی موضوع ہونا چاہیے اور ان موضوعات کا اسکول کی سطح پر بچوں کے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے چناچہ زیرِ بحث تناظر کی روشنی میں اس موضوع کا انتخاب کیا گیا اور اس حوالے سے بنیادی سوالات مرتب کیے گئے ہیں جن کا تجزیہ اس تحقیق کے مختلف ابواب میں شامل کیا گیا ہے۔

۱۔ ادبیات اطفال کی نظموں اور کہانیوں میں فطرت اور ماحول کی پیش کش کس نوعیت کی ہے؟

۲۔ ان نظموں اور کہانیوں میں فطرت کو لاحق خطرات کس طرح بیان کیے گئے ہیں؟

۳۔ادبیات اطفال میں شامل نظموں اور کہانیوں میں فطرت کے تحفظ کے ضمن میں انسانی ذمے داریوں کا کیا کردار ہے؟

۴۔ فطرت سے متعلق بچوں کے شعور کو کس طرح اجاگر کیا جاسکتا ہے؟

نتائج:

ا۔ ادبیات اطفال کی نظموں اور کہانیوں میں فطرت اور ماحول کی پیش کش کس نوعیت کی ہے؟

ادبیات اطفال کی نظموں اور کہانیوں میں فطرت اور ماحول سے متعلق بچوں میں شعور پیدا کرنے اور فطرت کے بکھرے ہوئے رنگوں اور مظاہر کے ذریعے بچوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ادبیاتِ اطفال کے رسالوں میں شعرا نے سب سے زیادہ توجہ موسموں اور مختلف اوقات (صبح، دوپہر، شام) پر دی۔ ان نظموں میں زمینی اور آبی جانوروں اور چڑیا گھر جیسے موضوعات پر ۲۴ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ تتلیوں، جگنوؤں اور شہد کی مکھی پر دس نظمیں، خوب صورت پرندوں پر گیارہ جب کہ سمندر، دریا اور ندیوں وغیرہ پر پانچ نظمیں ان رسالہ جات میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف نظاروں پر آٹھ،، پھولوں پر تین اور دنیا کے متعلق ایک نظم لکھی گئی۔ اس طرح خلا کے حوالے سے سورج کے متعلق ایک نظم جب کہ چاند سے دو نظموں کا رشتہ جوڑا گیا۔ ان رسالہ جات کی ستاسی نظموں میں سے صرف ایک نظم "آؤ بچوں پیڑ لگائیں" درخت کے حوالے سے صاحبزادہ سمیع الوریٰ نے لکھی۔ ان کہانیوں میں مصنفین نے کوشش کی ہے کہ بچے فطرت سے محبت کریں، فطرت سے سیکھیں اور فطرت کے ساتھ ظلم وزیادتی نہیں ہونی چاہیے۔

۲۔ان نظموں اور کہانیوں میں فطرت کو لاحق خطرات کس طرح بیان کیے گئے ہیں؟

یہ انتہائی اطمینان بخش بات ہے کہ ادبیاتِ اطفال میں لکھنے والے نثر نگاروں نے فطرت اور ماحول کے تحفظ کی بات کی۔ انسان کے منفی رویے، غفلت اور عدم توجہی کے سبب فطرت اور ماحول کو ہونے والے نقصان نیز آئندہ موسمیاتی تبدیلیوں کے نتیجے میں فطرت اور انسان کی بقا کو لاحق ہونے والے خطرات سے بھی آگاہ کیا۔ تتلیوں، پرندوں اور جانوروں کو قیدی بنانا، پھول توڑنا، درختوں کو کاٹنا، آبی اور فضائی آلودگی پھیلانا وغیرہ جیسے افعال سے سخت نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان مصنفین میں ڈاکٹر شعیب خان اہم ہیں۔ ادبیاتِ اطفال کے شمارہ نمبر دس میں شامل ڈاکٹر شعیب خان کی لکھی ہوئی کہانی "ندی کا انتقام" ماحولیاتی آلودگی کے موضوع پر تحریر کی گئی ہے۔ مصنف کی دیگر کہانیوں میں "زمین کا مقدمہ" ۲۰۲۱ء اور "طوطے کا پیغام" ۲۰۲۲ء کے شمارے میں شامل کی گئی ہے۔

اسی طرح ۲۰۱۷ کے شمارے میں فرزانہ روحی اسلم کی کہانی "چار اطخ چار بطخ "شامل کی گئی ہے جو ماحولیاتی آلودگی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ادبیاتِ اطفال میں کچھ مزید کہانیاں بھی موجود ہیں۔

۳۔ادبیات اطفال میں شامل نظموں اور کہانیوں میں فطرت کے تحفظ کے ضمن میں انسانی ذمے داریوں کا کیا کردار ہے؟

برصغیر میں ماضی کے شعرا نے فطرت کے متعلق بہت کچھ لکھا لیکن جب تالاب، ندیا اور دریاؤں میں شفاف پانی بہتا تھا، باغوں میں بلبل اور خوب صورت پرندے چہچہاٹ اور پھول سرگوشیاں کرتے نظر آتے۔ آبادیاں کم اور جنگلات کثرت سے تھے۔ گاڑیاں اور کارخانے بہت کم تعداد میں تھے۔ لوگ دودھ پلاسٹک کے بیگوں کے بجائے برتنوں میں لے کر آتے تھے اور سودا سلف خریدنے کے لیے کپڑے کے تھیلے گھر سے لے جاتے۔ پلاسٹک کے تھیلوں کے جگہ کاغذ اور گتے کا استعمال ہوتا۔ فضائی آلودگی نہیں تھی۔ برصغیر میں سموگ کا کوئی تصور نہ تھا۔ جگنو، تتلیاں، پرندے اور جنگلی حیات معدومیت کے خطرے سے دوچار نہیں تھے۔ لہذا اس وقت کے لکھاری موسمیاتی تبدیلیوں سے اس قدر آشنا نہ تھے کہ وہ فطرت کو لاحق خطرات اور ہماری ذمہ داریوں جیسے موضوع پر قلم اٹھاتے یہ اُن کا مسئلہ نہیں تھا۔ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال کا آغاز ۲۰۱۷ء میں ہوا اور ماحولیاتی تبدیلی اس دور کا اہم ترین موضوع ہے۔ اس لیے ۲۰۱۷ء تا ۲۰۲۳ء تک شائع ہونے والے رسالہ جات کی چھے سو کہانیوں اور ایک سو ۱۹۸ نظموں میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔ پاکستان کے معروف ترین ادارہ اکادمی ادبیاتِ اطفال اسلام آباد کی جانب سے شائع ہوئے۔ رسالہ سہ ماہی ادبیاتِ اطفال میں آج کے شعرا اور ادیب موسمیاتی تبدیلیوں کے تناظر میں فطرت کو لاحق خطرات اور فطرت کے تحفظ کے متعلق بچوں کا آگاہ کرنے اور اس سلسلہ میں اُن میں شعور بیدار کرنے تک یہاں تک کوشاں ہیں۔ ۲۰۱۷ء تا ۲۰۲۳ء رسالہ جات میں شعرا نے بھی فطرت کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ لیکن موسمیاتی تبدیلیوں کے حوالے سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ البتہ نثری تحریروں میں بچوں کے لیے ماحولیاتی کہانیاں تحریر کی گئی۔ بچوں کو موسمیاتی تبدیلیوں سے متعلق آگاہ کیا گیا۔ ان کہانیوں میں فطرت کی تباہی اور ماحولیاتی آلودگی کا ذمہ دار خود انسان کو قرار دیا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے کے لیے بچوں، شہریوں اور حکومتی حلقوں کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں اُن میں شعور بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴۔ فطرت سے متعلق بچوں کے شعور کو کس طرح اجاگر کیا جاسکتا ہے؟

موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آنے والی نسل کا مستقبل ایک ڈروناخواب بن چکا ہے۔ جہاں آبی آلودگی، فضائی آلودگی، زمینی آلودگی، غذائی قلت، قدرتی آفات اور شدید موسمی حالات اُن کی زندگی کا حصہ بن جائیں۔ انواع

معدوم ہو جائیں گی۔ اس حوالے سے جارج مونبیاٹ نے بھی خبر دار کیا ہے۔ ان کے خیالات اور جذبات، فطرت سے محبت، ماحولیاتی پاکیزگی اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کی خواہش کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف اُن کا ذاتی احساس ہے بلکہ ایک عالمی پیغام بھی ہے جو دنیا کو عالمی بحران سے باہر نکالنے کے لیے فکر مند ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون "The child inside" میں لکھتے ہیں کہ:

"دورِ حاضر میں بچے کنکریٹ کے جنگل میں پرورش پا رہے ہیں۔ وہ گھروں اور اسکولوں اور گاڑیوں کے اندر تک محدود ہیں وہ فطرت کے دلکش رنگوں سے محروم ہیں۔ جس قدرتی ماحول میں ہم پروان چڑھے فطرت کے وہ حسین رنگ ہماری آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہے ہیں۔"[6]

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے جس میں لوگ افراتفری کا شکار ہیں ان کے پاس فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہی نہیں۔ اب وہ دور نہیں رہا جب بچے سرسبز اور شاداب کھیتوں میں سیر کرتے، گندم، مکئی اور چاولوں کے موسم میں لطف اندوز ہوتے، دریاؤں اور نہروں میں تیراکی کرتے، سرسبز درختوں اور پودوں سے تازہ پھل اور سبزیاں کاٹتے، جانوروں کی پرورش کرتے، تروتازہ ہوا میں سانس لیتے، قدرتی ماحول میں پرورش پاتے، مگر آج کل کے بچے ان حقیقی خوشیوں سے محروم ہیں ان کو ویڈیو گیمز، کارٹون چینلز، موبائل فون، الیکٹرانک میڈیا جیسی مصنوعی خوشیاں مہیا کی جارہی ہیں۔ انسان اپنے فائدے کے لیے فطرت کا استحصال کر رہا ہے اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ماحول میں الودگی بڑھ رہی ہے، عالمی حدت میں اضافہ ہو رہا ہے، سمندروں کی سطح بلند ہو رہی ہے، گلیشئرز پگھل رہے ہیں، جانور ناپید ہوتے جارہے ہیں اور نئی نئی بیماریاں جنم لے رہی ہیں اور قدرتی آفات اب معمول بن چکی ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ موسمیاتی تبدیلی ایک مسئلہ ہے جیسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یہ خود تھم جانے والا طوفان نہیں ہے آج کا انسان جس طریقے اور لاپروائی سے زندگی گزار رہا ہے اسے آنے والی تباہی سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ مستقبل میں ایسی سرزمین میں رہنے کے خواہاں ہیں جہاں آنے والی نسلیں محفوظ رہیں جو اُن کی ملکیت ہو جہاں وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے زمینی اخلاقیات کا خیال رکھیں تو پھر ہی بنجر زمین سرسبز ہو سکتی ہے جو جنگلات کی کٹائی اور شدید ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے مرجھا گئی ہے شاہد پھر سے مسکرانے لگے۔ سمندر یمو سمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آنے والی نسل کا مستقبل ایک ڈروناخواب بن چکا ہے۔ جہاں آبی آلودگی، فضائی آلودگی، زمینی آلودگی، غذائی قلت، قدرتی آفات اور شدید موسمی حالات اُن کی زندگی کا حصہ بن جائیں۔ انواع معدوم ہو جائیں گی۔ یہ بات

درست ہے کہ موسمیاتی تبدیلی ایک مسئلہ ہے جیسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یہ خود تھم جانے والا طوفان نہیں ہے آج کا انسان جس طریقے اور لاپروائی سے زندگی گزار رہا ہے اسے آنے والی تباہی سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ مستقبل میں ایسی سرزمین میں رہنے کے خواہاں ہیں جہاں آنے والی نسلیں محفوظ رہیں جو اُن کی ملکیت ہو جہاں وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے زمینی اخلاقیات کا خیال رکھیں تو پھر ہی بنجر زمین سرسبز ہو سکتی ہے جو جنگلات کی کٹائی اور شدید ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے مرجھا گئی ہے شاید پھر سے مسکرانے لگے۔ سمندری حیات جو انسانی مداخلت کے سبب ختم ہو گئی ہیں شاہد واپس آجائیں۔ یعنی سمندر اور زمین دونوں میں فطری توازن بحال ہو جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مستقبل میں آنے والی نسلیں خوبصورت، محفوظ اور قدرتی دنیا کو دیکھیں۔ ایک ایسی جگہ جہاں پھول کھلتے ہوں، جگنو تاروں کی طرح ٹمٹماتے ہوں، پھولوں کے گرد منڈلاتی ہوئی رومان پرور تتلیاں ہوں، لہلاتے کھیت ہوں، ہرے بھرے مسافر نواز درخت ہوں اور موسم خوشگوار ہو۔ اگر ماحول پھر سے بحال ہو جائے تو معاشی بحالی ہو گی۔ ماہی گیر، زمیندار اور دیگر افراد جو قدرتی وسائل پر انحصار کرتے ہیں پھر سے مسکرانے لگیں گے۔ ماحول کی پاکیزگی معیشت کو بھی فائدہ پہنچائے گئی۔ ادبیات اطفال کی کہانیوں اور نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد درج ذیل تجاویزات کو زیر غور لایا جاسکتا ہے:

- بچوں کو تقریباً ہر تعلیمی سیشن میں دیہات کی سیر ضرور کروانی چاہیے تاکہ وہ قدرتی ماحول سے ہم آہنگ ہو سکیں۔
- بچوں کو ماحولیاتی تعلیم دینا بہت ضروری ہے تاکہ وہ زمینی اخلاقیات کو سمجھ سکیں۔
- موجودہ نظام بچوں کے مستقبل کو تاریک کر رہا ہے۔ آئندہ آنے والی نسلوں کو محفوظ ماحول میں نے جینے کا حق ہے اس لیے بچوں کے لیے نئے انسانی حقوق کی ضرورت ہے۔
- فطرت کی بحالی کی مہمات مثلاً شجر کاری کی مہمات سے روشناس کروانا چاہیے۔
- پالیسی میں تبدیلی کے مطالبات وغیرہ شامل ہیں
- بچوں کے علاوہ دورِ حاضر میں ستر کی دھائی کی طرح تعلیمِ بالغاں کی بھی اشد ضرورت ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کے بچے جب ایک ذمہ دار شہری بننے تب تک پانی سر سے گزر جائے۔

سفارشات:

مجوزہ تحقیق میں سہ ماہی ادبیات اطفال کے شمارے (۲۰۱۷ء سے ۲۰۲۲ء) میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان شماروں میں حمد و نعت، طبع زاد نظمیں، کہانیاں، عالمی ادب اور پاکستانی ادب سے تراجم شامل ہیں تاہم مجوزہ تحقیق کو صرف طبع زاد نظموں اور کہانیوں تک محدود رکھ کر ان کے حوالے سے ادبیات اطفال کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ تحقیقی نتائج کی روشنی میں درج ذیل عنوانات کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے:

۱۔ فطرت بطور اتالیق اور علامہ اقبال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ سید رفیق حسین کے افسانے آئینۂ حیات، بے زبان، شریں فرہاد، کلوّا اور افسانہ کفارہ میں فطرت اور انسان کے باہمی تعلق پر کام کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ فطرت کے استحصال پر نو آبادیاتی عہد کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ سہ ماہی ادبیات اطفال (۲۰۱۷ء سے ۲۰۲۳ء) میں عالمی ادب اور پاکستانی ادب سے تراجم پر شامل کہانیوں میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ موسمیاتی تبدیلیوں نے اپنے تیور دکھانے شروع کر دیے ہیں آنے والے پہ در پہ زلزے، سیلاب، اربن فلڈنگ، بادل کا پھٹنا، شدید گرمی، اسموگ، آسمانی بجلی کی تباہ کاریاں، بگولے، نئی نئی وبائی امراض اور جنگلات میں لگنے والی آگ جیسی قدرتی آفات کے متعلق بچوں میں شعور اجاگر کرنے اور اس سلسلے میں حفاظتی اقدامات کے متعلق تعلیم و تربیت کے لیے نہ صرف نظمیں اور کہانیاں تحریر کرنے کی ضرورت ہے بلکہ یہ موضوعات اسکول اور کالج کی سطح پر بچوں کے نصاب کا شامل ہونا چاہیے۔

فہرستِ مآخذ

اعزاز، باقر (مترجم)، نوم چومسکی کے خطبات، (ماحولیاتی بحران) لاہور: مشعل بکس، ۲۰۲۱ء۔

اشرف، ثوبیہ۔ بچوں کے ادب کی ترویج مین ثاقبہ رحیم الدین کا کردار مقالہ برائے ایم ۔ایس۔ اردو بین الاقومی یونیورسٹی اسلام آباد۔ ۲۰۱۴ء۔

احمد، گلناز۔ ماہانامہ پھول کی نظم و نثر میں تربیت اطفال کے عناصر۔ مقالہ برائے ایم۔ایس ، بین الاقومی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ ۲۰۱۴ءء۔

جوادی، آیۃ اللہ۔ اسلام اور ماحولیات، مترجم: شیخ محمد حسنین۔ اسلام آباد: ثقافتی کونسلٹ اسلامی جمہوریہ ایران ، ۲۰۱۷ء۔

جالبی، جمیل۔ قومی انگریزی اردو لغت (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء)، ص ۶۴۶۔

جے ایلچیمین (J.L.Chapman)، ایم، جے ریائس (Michael J.Resis)، Ecology,principal and applications (کیمبریج یونی ورسٹی ۲۰۰۰ء)، ص ۲۔

حسین، جعفر۔ مترجم، نحج البلاغہ (راولپنڈی: مرکزِ افکار اسلامیہ، ۲۰۲۰ء)، ص ۲۹۶۔

حسین، زوار۔ "فطرت کا جمالیاتی تکلم" مشمولہ ماہِ نو، ش ۷ (جولائی ۱۹۹۷ء)، ص ۳۱۔

خالد اقبال یاسر، جدید تحریکات اور اقبال (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۲۵ء)، ص ۱۴۵۔

دانش، احسان۔ نفیرِ فطرت۔ لاہور: مکتبہ دانش افروز، ۱۹۴۶ء۔

رحمانی، اکبر۔ اردو میں ادب اطفال ایک جائزہ۔ جلگاؤں: ایجوکیشنل اکادمی۔ ۱۹۹۱ء۔

علی، سبین۔ "اداریہ: ماحولیاتی ادب و تنقید"، مشمولہ دیدبان ش ۳، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲۔

فاطمہ، مشیر۔ بچوں کے ادب کی خصوصیات۔ علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۲ء۔

فرمینز، کرسٹیو "فطرت اور خاموشی"، مشمولہ، ماحولیاتی تنقید نظریہ و عمل ، اورنگزیب نیازی لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء۔

قاسم، یعقوب۔ "ارض و سما کے دو پہیے اور مجید امجد"۔ مشمولہ، بنیاد۔ ج ۲۰۱۲، ۱۲ء

قاسمی، ناہید۔ جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری" کراچی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۲۔

قمر، نوشین۔ "ماحولیاتی تنقید"، مشمولہ بنیاد، ش ۱۳، جون ۲۰۱۲ء۔

گوگا، نینا۔ (Nana Goga)، لکے گوانیو (Lykke Guanio)، اسلنگ نیرنیس، (Aslang Nyrnes)، Ecocritical Perspective on Children's Text and culture۔ ناروے: پالگریو میک میلن، ۲۰۱۸ء۔

لکھنوی، اثر۔ عروس ِفطرت۔ ہریانہ: عرفی پبلی کیشنز، ۱۹۶۲ء۔

مطہری، مرتضی۔ فطرت۔ مترجم: ریاض حسین جعفری۔ لاہور: ادارہ منہاج الصالحین

نیر، ناصر عباس۔ حرف اول، مشمولہ ماحولیاتی تنقید :نظریہ و عمل (منتخب مضامین)، (مترجم) اورنگزیب نیازی، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء۔

نیر، ناصر عباس۔ ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں، مشمولہ تحقیق نامہ، جلد ۲۱، لاہور: شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی، دسمبر ۲۰۱۷ء۔

نور، عظمیٰ۔ بچوں کی اخلاقی تربیت میں حکیم محمد سعید کا کردار،"۔ مقالہ برائے ایم ایس بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ ۲۰۱۲ء۔

نیازی، اورنگزیب، "ماحولیاتی تنقید: پس منظر، آغاز اور امتیازات،" مشمولہ، بنیاد ، ج 1۔ ۲۰۱۹ء۔

نیازی، اورنگزیب۔ اردو ادب : ماحولیاتی تناظر میں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء۔

یوسف،صوفیہ۔"حجاب کا ناول پاگل خانہ اور ماحولیاتی تنقید"۔مشمولہ الماس ۔ش۱۹،
۲۰۱۷ء۔

جے ایلچیمین(J.L.Chapman)،ایم،جے ریائس(Michael J.Resis)، Ecology,principal and applications(کیمبرج یونی ورسٹی ۲۰۰۰ء)،ص ۲۔

رسائل وجرائد:

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۲۱((اپریل تاجون۲۰۲۱ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۲۴(جنوری تامارچ۲۰۲۳ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۲(جولائی تاستمبر۲۰۲۰ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۲(جولائی تاستمبر۲۰۱۷ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۷(اپریل تاجون۲۰۲۱ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۷(اپریل تاجون۲۰۲۱ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۱۸(جولائی تاستمبر۲۰۲۱ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۰(جنوری تامارچ۲۰۲۰)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۳(اکتوبر تادسمبر۲۰۱۷ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۱۲(اپریل تاجون۲۰۲۲ء)
سہ ماہی ادبیات اطفال ،ش۱۰(جولائی تاستمبر۲۰۱۹ء)
سہ ماہی ادبیات اطفال ،ش۵(اپریل تاجوں۲۰۱۸ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۱۷(اپریل تاجون۲۰۲۱ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۲(جولائی تاستمبر۲۰۲۲ء)
سہ ماہی ادبیات اطفال ،ش۲۶(جولائی تاستمبر۲۰۱۸ء)
سہ ماہی ادبیات اطفال ،ش۲(جولائی تاستمبر۲۰۱۸ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۷(اکتوبر تادسمبر۲۰۱۸ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۹(اکتوبر تادسمبر۲۰۲۱ء)

سہ ماہی ادبیاتَ اطفال،ش۳(اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۷ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۹(اکتوبر تا دسمبر۲۰۲۱ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۵(اپریل تا جون۲۰۱۸ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۲۰(جنوری تا مارچ۲۰۲۰ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۱۲(اپریل تا جون۲۰۲۲ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۱۲(اپریل تا جون۲۰۲۲ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال،ش۱۲(اکتوبر تا مارچ۲۰۲۰ء)

سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۵(اپریل تا جون۲۰۱۸ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ش۲۲(جولائی تا ستمبر۲۰۲۲ء)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۲۲(جولائی تا ستمبر۲۰۲۲ء)
سہ ماہی ادبیات اطفال ،ش۴(جنوری تا مارچ)
سہ ماہی ادبیاتِ اطفال ،ش۷(اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۸ء)

انٹرنیٹ:

https://www.poetryfoundation.org/poems/45521/i-wandered-lonely-as-a-cloud، نظم،بتاریخ۲۳جون۲۰۲۴ءبوقت ۱۱:۵۵

https://www.poetryfoundation.org/poems/43986/frost-at-midnight ،نظمیں،بتاریخ۲۹جون۲۰۲۴ءبوقت ۱۱:۳۳۔ .

https://www.poetryfoundation.org/poems/45146/to-a-skylark

https://www.rekhta.org/nazms/ek-shaam-allama-iqbal-nazms-216?lang=ur ۔علامہ اقبال نظم،ریختہ بتاریخ۲۸جونءبوقت ۱۰:۳۶

https://www.rekhta.org/nazms/shabnam-aur-sitaare-allama-iqbal-nazms-175?lang=ur،علامہ اقبال نظم،ریختہ لغت،بتاریخ۲۸جونءبوقت ۱۰:۳۸۔

https://www.rekhta.org/stories/kaffaara-rafiq-husain-stories?lang=ur
،رفیق حسین، ریختہ لغت، بتاریخ ۲ جولائی ۲۰۲۴ء بوقت ۱۰:۳۳
https://www.rekhta.org/nazms/jugnuu-allama-iqbal-nazms-279?lang=ur، جگنو، ریختہ لغت، ۱۴ جولائی بتاریخ ۲۰۲۴ء، بوقت ۵:۵۵۔
https://www.urduweb.org/mehfil ، محفل، اُردو محفل، بتاریخ ۲۵ جولائی ۲۰۲۴ء، بوقت ۳:۴۴۔
https://www.urduweb.org/mehfil۔اُردو محفل، بتاریخ ۱۴ اگست ۲۰۲۴ء۔
https://www.rekhta.org/ ، ریختہ لغت، بتاریخ ۲۳ اگست ۲۰۲۴، بوقت ۱۰:۳۴۔
۴۔https://www.azquotes.com/author/19049-George_Monbiot ، جارج مونبیاٹ، بتاریخ ۲ فروری ۲۰۲۵ء بوقت ۲:۳۴۔
https://jimcarroll.com/2019/11/۔بتاریخ ۵ فروری ء بوقت ۱۲:۵۵۔
https://www.monbiot.com/2015/01/06/the-child-inside/، جارج مونبیاٹ بتاریخ ۲ جون ۲۰۲۵ء بوقت ۱۰:۳۱
https://www.monbiot.com/2015/01/06/the-child-inside/، جارج مونبیاٹ بتاریخ ۲ جون ۲۰۲۵ء بوقت ۱۲:۳۴
https://www.bbc.com/urdu/science-54106922 ، اُردو سائنس بتاریخ ۳ جون ۲۰۲۵ء ، بوقت ۱۲:۳۴۔
آمنہ مفتی، "لاہور کھو رہا ہے"۔https://www.bbc.com/urdu/pakistan-59362888 ۔بتاریخ ۷ مارچ ۲۰۲۵ء بوقت ۱۰:۳۳
شاہد اقبال، "ادبِ اطفال، روایت و مسائل https://www.urdulinks.com ، بتاریخ ۷ ستمبر ۲۰۲۵ء بوقت ۱۶:۴۔
ناصر محمود، گم ہوتی تتلیاں۔https://www.urduvoa.com/a/pakistan-butterflies ۔بتاریخ ۲ مارچ ۲۰۲۵ء بوقت ۳:۳۴۔